Tele : 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری ۱۹۵۹ء

رسول اللہ (ص) نے کیا چھوڑا ؟

عَنْ عَبْدِالعَزِيزِ بْنِ رُفَيْعٍ قَالَ دَخَلْتُ أَنَا وَ شَدَّادُ بْنُ مَعْقِلٍ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا فَقَالَ لَهُ شَدَّادُ بْنُ مَعْقِلٍ "أَتَرَكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ مِنْ شَيْءٍ؟ قَالَ "مَا تَرَكَ إِلَّا مَا بَيْنَ الدَّفَّتَيْنِ" قَالَ وَ دَخَلْنَا عَلَى مُحَمَّدِ بْنِ الْحَنَفِيَّةِ فَسَأَلْنَاهُ، فَقَالَ "مَا تَرَكَ إِلَّا مَا بَيْنَ الدَّفَّتَيْنِ"

(امام بخاری) عبدالعزیز بن رفیع سے راویت کرتے ہیں کہ میں اور شداد بن معقل حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے ، پھر شداد بن معقل نے ان سے دریافت کیا "کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے کوئی چیز چھوڑی تھی ؟" انہوں نے جواب دیا "آپ نے مابین الدفتین (یعنی مجلد قرآن مجید) کے علاوہ کچھ نہیں چھوڑا" عبدالعزیز بن رفیع کہتے ہیں کہ پھر ہم دونوں محمد بن الحنفیہ کی خدمت میں پہنچے اور ان سے بھی یہی بات دریافت کی تو انہوں نے کہا "آپ نے مابین الدفتین کے علاوہ کچھ بھی نہیں چھوڑا"

(صحیح البخاری ۔ جلد سوم ۔ صفحہ ۱۳۳ ۔ مطبع بہیۃ مصریہ ۱۳۴۵ ھ

شائع کردہ :۔

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

بدل اشتراک
ہندوستان اور پاکستان کو سالانہ آٹھ روپے
غیر ممالک سے ـــ [illegible] شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوستان اور پاکستان سے
بارہ آنے

ٹیلی فون نمبر 7500
خط و کتابت کا پتہ: ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵ بی گلبرگ کالونی ـــ لاہور

جلد ۱۲ | جنوری سنہ ۱۹۵۹ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

لمعات		۲
مجلس اقبال		۹
تفسیر المنار		۱۸
اسلام کی سرگذشت	ڈاکٹر احمد امین مصری مرحوم	۳۳
نقد و نظر		۴۹
باب المراسلات		۶۲
حقائق و عبر		۶۶
رابطہ باہمی		۷۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت کے لمعات میں، اختصار الفاظ میں بتایا گیا تھا کہ اسلامی نظام کے نمایاں خط و خال کیا ہیں اور اسے مملکت پاکستان میں کس طرح نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں ہم نے آخر میں لکھا تھا۔

> لیکن اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ قرآنی نظام اپنی حقیقی روح کے مطابق اسی صورت میں نافذ اور نتیجہ خیز ہوگا جب اس کے تقاضے دل کی گہرائیوں سے ابھریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کریں جس سے ہمارے نوجوانوں کا قلب و دماغ قرآن کے قالب میں ڈھل جائے تاکہ وہ قرآنی نظام کی محکمیت و صلابت کے علی وجہ البصیرت قائل ہوں اور اس کی رُو سے نہ صرف پاکستان بلکہ پوری نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل دریافت کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اس سے ہماری سیرت میں بلندی اور کردار میں پختگی پیدا ہوگی۔

اس کے بعد ہم نے قوم کی عام اخلاقی حالت کا ایک منظر پیش کرتے ہوئے لکھا تھا۔

> ایسی قوم کے ہنگامی مفاسد کی روک تھام تو ہنگامی احکام و تدابیر سے ہو سکتی ہے۔ ان کا مستقل علاج اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ان کی آنے والی نسل کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو۔ لہٰذا ہمارے جدید آئین میں اس امر کی بھی صراحت ہونی چاہیئے کہ قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت کی پوری پوری ذمہ داری مملکت پر ہوگی اور اس کے بنیادی خط و خال وہ ہوں گے جنہیں قرآن نے تجویز کیا ہے۔

۲۰ دسمبر کو، لاہور میں، گلستانِ فاطمہ کی سرسبز و شاداب فضاؤں میں، محترم صدرِ مملکتِ پاکستان نے تعلیمی کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا۔ اس کمیشن کے متعلق: حکومتِ پاکستان کی طرف سے جو اعلامیہ شائع ہوا ہے اس میں اس کے حدودِ تحقیق و سفارشات Terms of Reference حسبِ ذیل بتائے گئے ہیں۔

۱۔ تعلیم کے مختلف مدارج اور ان کی میعاد کا تعین

۲۔ یونیورسٹی میں داخلہ کے لئے تعلیمی قابلیت کا تعین اور موجودہ انٹرمیجیٹ کلاسوں کی پوزیشن کے بارے میں غور و خوض۔

یونیورسٹی کی تسلیم ۳— یونیورسٹی کی ڈگریوں کی تعلیمی مدت (اس میں پاس، آنرز، اور پوسٹ گریجویٹ ڈگریاں شامل ہیں)

۴ — اعلیٰ تعلیم اور تحقیقاتی کام — (۵) — سائنسی اور تکنیکی تعلیم۔

۶ — یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تدریس و تحقیق کے بلند ترین معیار کا حصول اور مختلف یونیورسٹیوں کے درمیان تخصیصی تحقیقات کے سلسلہ میں تعاون کی ضرورت۔

۷ — وہ تبدیلیاں جن کا یونیورسٹیوں کے آئین و دستور، ساخت، انتظامی امور، کنٹرول اور حدود و اختیارات کے سلسلہ میں ہونا ضروری اور مفید و مناسب ہو۔ ۸ — اسلامی اور مشرقی علوم و تعلیمات کی ترقی۔ (۹) یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ کی تعلیمی قابلیت، ملازمت کی شرائط، ترجیحی مراعات اور ذمہ داریاں۔ (۱۰) طلبا کا ڈسپلن، سماجی اور ثقافتی سرگرمیاں اور تعلیم کے ٹیوٹوریل طریقے کو فروغ دینا۔ (۱۱) یونیورسٹیوں اور کالجوں کے مالیاتی امور (۱۲) امتحانات کے طریقوں اور نظام کو بہتر بنانا۔

پیشہ ورانہ تعلیم — (۱۳) مختلف پیشہ ورانہ تعلیمی کورسوں میں داخلہ کیلئے تعلیمی قابلیت۔ (۱۴) مختلف ڈگریوں اور ڈپلوما کے لئے تعلیم کی میعاد۔ (۱۵) پیشہ ورانہ تعلیم کے اداروں اور اُن میں تحقیقاتی کام کی تنظیم۔

ثانوی تعلیم — (۱۶) ثانوی تعلیم کی حد بندی، علوم اور موضوعات کا تعین، اور تنظیم۔ (۱۷) ملت کی ضروریات کے مطابق ثانوی تعلیم کے کورسوں اور نصابوں میں تنوع اور پھیلاؤ۔ تکنیکی، زرعی اور پیشہ ورانہ تعلیم۔ (۱۸) گریڈ مقرر کرنے اور امتحانات کے طریقے۔ (۱۹) انتظام اور نگرانی۔ (۲۰) استادوں کی تعلیمی قابلیت، ملازمت کی شرائط، مراعات اور فرائض۔ (۲۱) اساتذہ کی تربیت بشمولیت تربیت دوران ملازمت۔ (۲۲) درسی کتابوں کی منظوری، تیاری اور فراہمی۔

ابتدائی تعلیم — ابتدائی تعلیم کے حدود، موضوعات کا تعین اور تنظیم۔ (۲۴) عام ابتدائی تعلیم کے مالی مسائل (۲۵) کنٹرول انتظام اور نگرانی۔ (۲۶) استادوں کی تعلیمی لیاقت، ملازمت کی شرائط، مراعات اور ذمہ داریاں (۲۷) اساتذہ کی تربیت بشمول تربیت دوران ملازمت۔ (۲۸) درسی کتابوں کی منظوری، تیاری اور فراہمی۔

تعلیم بالغان — (۲۹) وہ اقدامات اور طریقے جو بالغوں میں جہالت کم کرنے کے لئے ضروری ہوں۔

جسمانی تعلیم — (۳۰) جسمانی تربیت اور کھیلوں کے لئے تعلیمی نظام میں مناسب گنجائش۔

فوجی تربیت — (۳۱) تعلیمی اداروں میں نیشنل کیڈٹ کور (قومی کیڈٹ دستہ) کا قیام۔ (۳۲) وہ دوسرے تمام امور جو قومی تعلیمی مسائل کی مناسب تحقیقات کے لئے بنیادی اور ضروری ہوں۔

مذہبی تعلیم — (۳۳) مکتبوں، مدرسوں، دار العلوم اور مذہبی نوعیت کے دوسرے پرائیویٹ اسکولوں کا معائنہ اور جائزہ۔

ان تفاصیل سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ اس کمیشن کا تعلق زیادہ تر تعلیمی اداروں کے نظم و نسق۔ قواعد و ضوابط اور طرق و اسالیب تعلیم سے ہے تعلیم کی غایت و مقصد اور منتہیٰ و مطلوب سے نہیں۔ یعنی یہ کمیشن اسی انداز کا ہے جس انداز کا (جدید)

قانونی کمیشن ہے جس کے پیشِ نظر عدالتوں کے طریقِ کار کی تحقیق و اصلاح ہے نہ کہ قوانین میں تغیر و تبدل۔ اس میں شبہ نہیں کہ جس مقصد کے لئے اس کمیشن کا تقرر ہوا ہے وہ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ جس کمیشن کی حدودِ تحقیق و سفارشات وہ ہوں جن کی تفصیل اوپر دی جا چکی ہے وہ کمیشن اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتا۔ جو ہمارے پیشِ نظر ہے اور جس کی طرف محترم صدرِ مملکت، جنرل محمد ایوب خاں صاحب نے اپنے مختلف بیانات و تقاریر میں اشارہ کیا ہے۔ شروع دسمبر میں انھوں نے کوئٹہ میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> ہمارا ملک غریب ہے اور تعلیمی ترقی کے لئے اس کے ذرائع محدود ہیں، علاوہ بریں ہم نے فیصلہ کرنا ہے کہ آئندہ دس پندرہ سال تک، ملک کا نظم و نسق چلانے اور زندگی کے مختلف گوشوں میں قیادت کے لئے ہماری ضروریات کیا ہیں۔ ہمارا موجودہ طریقۂ تعلیم لوگوں کو صرف لکھنا پڑھنا سکھاتا ہے۔ لیکن ہماری اشد ضرورت، یقین محکم، مضبوط کردار، ذمہ داریاں سنبھالنے کی ہمت اور دیگر ایسے جوہروں کی تخلیق ہے جو ایک آزاد قوم کی زندگی کے لئے ناگزیر ہوتے ہیں۔
>
> (پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۳ دسمبر)

۱۳ دسمبر کو گلستانِ فاطمہ میں۔ ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا تھا۔

> اکتوبر کے انقلاب کا فلسفہ وہی تھا جو پاکستان کی تخلیق کا موجب بنا تھا۔ برسوں کی بدنظمی اور بددیانتی نے اس فلسفہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا اور اس تحریک کے اغراض و مقاصد کو دھندلا اور زنگ آلود بنا دیا تھا جو تشکیلِ پاکستان پر منتج ہوئی تھی۔ اب حکومت کے سامنے سب سے اہم کام یہ ہے کہ ان مقاصد و مطالح کو اس دلدل سے نکال کر اس طرح صیقل کیا جائے کہ انھیں ان کی کھوئی ہوئی چمک دمک اور گم گشتہ عزت و عظمت پھر سے نصیب ہو جائے۔
>
> (پاکستان ٹائمز ۱۴ دسمبر)

صاحب صدر نے ان ہر دو مواقع پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے ملک میں ایسی تعلیم ہونی چاہیئے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ۔

(۱) ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن میں، پاکستان کا نصب العین۔ وہ فلسفۂ حیات جس کی بنیادوں پر اس کی عمارت اٹھے گی۔ اس معاشرہ کا نقشہ جس کے متشکل کرنے کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا ہے وہ اقدار جن کے تحفظ اور نشر و اشاعت کے لئے ہمیں ایک آزاد مملکت کی ضرورت لاحق ہوئی تھی۔ اس طرح نمایاں۔ صاف اور واضح ہو جائیں کہ ان میں نہ کسی قسم کا ابہام و التباس رہے اور نہ ان کی صداقت و محکمیت کے متعلق کسی قسم کا شک اور اضطراب۔

(۲) ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ بلا امداد غیرے ملک کا نظم و نسق چلانے کا اہل ہو۔

(۳) یہ طبقہ زندگی کے مختلف گوشوں میں عوام کی صحیح راہ نمائی کرنے کے قابل ہو۔

(۴) یہ ان تمام جوہروں سے آراستہ ہو جن کی ایک آزاد مملکت کو ضرورت ہوتی ہے اور

(۵) یہ طبقہ سیرت کی بلندی اور کردار کی پختگی کا زندہ پیکر ہو۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں تعلیم کے اغراض و مقاصد اور مآل و نتائج کے سلسلہ میں اس فہرست میں کسی اضافہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن (جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے) تعلیمی کمیشن کی تحقیقات و سفارشات کے لئے جو حدود متعین کی گئی ہیں وہ ان مقاصد کے حصول کے لئے کافی نہیں؛ ان حدود کا دامن بہت تنگ ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے ان کے دائرہ تحقیق اور حدود سفارشات دونوں میں بڑی وسعت کی ضرورت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کمیشن کی حدود میں (۱) اسلامی اور مشرقی علوم و تعلیمات کی ترقی اور (۲) مذہبی مکاتب و مدارس کا معائنہ اور جائزہ بھی شامل ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس سے بھی وہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے جن کی صراحت صدر مملکت نے اپنی ان تقاریر میں کی ہے جن کے اقتباسات اوپر دیئے گئے ہیں۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے کس قسم کی تعلیم ہونی چاہیئے، اس سوال کے تفصیلی جواب کے لئے تو ایک مبسوط تصنیف کی ضرورت ہو گی۔ لیکن اگر اسے ایک فقرہ میں بیان کرنا چاہیں تو کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم ان خطوط پر ہونی چاہیئے جن کا تعین قرآن نے کیا ہے یعنی "اسلامی تعلیم"۔ لیکن "اسلامی تعلیم" سے آپ کا ذہن فوراً ان مذہبی مکاتب، مدارس اور دارالعلوموں کی طرف منتقل ہو جائے گا جن میں "علماء" تیار کئے جاتے ہیں اور اس سے آپ کے لبوں پر خفیف سی ہنسی کھیل جائے گی (آپ کی پیشانی پر ہلکا سا شکن پڑ جائے گا)۔ لیکن اگر آپ قرآن سے پوچھیں گے تو وہ بتلائے گا کہ (اور باتوں کو چھوڑیئے خود) "علماء" کی تعریف (Definition) بھی وہ نہیں جو ان مکتبوں اور دارالعلوموں میں بھی اور بتائی جاتی ہے۔ قرآن نے "علماء" کا لفظ ٹھیک ان معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں آج سائنسدان (scientists) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً سورۃ فاطر میں ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا۔ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ۔ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (۳۵/۲۷-۲۸)

کیا تو نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ اللہ (اپنے طبعی قوانین کے مطابق کس طرح) بادلوں سے بارش برساتا ہے اور اس سے قسم قسم کے پھل پیدا کرتا ہے۔

اور اس پر بھی غور نہیں کیا کہ (پہاڑوں میں (کس طرح) مختلف طبقات ہیں کوئی سفید، کوئی سرخ، کوئی کالا بھجنگ۔ (ان کے علاوہ) اور رنگا رنگ کے طبقات۔

اسی طرح انسانوں، عام حیوانوں، اور مویشیوں کی انواع و اقسام پر بھی کبھی غور کیا ہے؟)

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے بندوں میں صرف "علماء" ہی ہیں جو اس (کے قانون تخلیق و ربوبیت و ارتقاء) کی عظمت و ہیبت کے احساس سے لرزہ براندام رہتے ہیں (کیونکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت جانتے ہیں کہ خدا کتنے بڑے غلبہ کا مالک لیکن اس کے ساتھ ہی کائنات کی حفاظت کا ضامن ہے۔[1]

[1] اس مقام پر صرف ایک آیت پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیل معلوم کرنی ہو تو ادارہ کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ "علماء کون ہیں" ملاحظہ کیجئے۔

آپ سوچئے کہ علماء کی اس قرآنی تعریف (Definition) کے بعد ذہن کو ہمارے مروجہ دارالعلوموں کی طرف جانا چاہیئے یا علوم فطرت کے معملوں (Laboratories) کی طرف؟

یہ تو خیر ایک ضمنی بات تھی۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، ہماری تعلیم کی عمارت ان خطوط پر استوار ہونی چاہیئے جنہیں قرآن نے متعین کیا ہے۔ ہم یہ بات نہ محض نعلوفشن کہہ رہے ہیں اور نہ ہی کسی اندھی عقیدت کی بنا پر۔ یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے جو علیٰ وجہ البصیرت کیا جا رہا ہے۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ ہماری تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس زندگی کا تصور جس کے لئے پاکستان کا وجود عمل میں آیا ہے، صاف اور واضح طور پر ذہن نشین ہو جائے اور اس کی صداقت و محکمیت کا یقین دل میں راسخ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ نہج زندگی اور فلسفۂ حیات اس کے سوا اور کونسا ہو سکتا ہے جسے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا ہے جسے اسلام یا الدین کہتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اس کے لئے واضح طور پر معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام (یا دین) کیا ہے۔ اس کے تقاضے کیا ہیں۔ اس کا مقصود و مطلوب کیا ہے۔ وہ کس قسم کے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ان انسانوں کا نصب العین کیا ہوگا اور ان کی سیرت و کردار کس قسم کا۔ یہ انسان کس قسم کا معاشرہ قائم کریں گے۔ اس معاشرہ کے نتائج خود اپنی مملکت کے لئے کیا ہوں گے اور باقی عالم انسانیت کے لئے کیا۔ (وغیرہ وغیرہ)۔ اسی کا نام "اسلامی تعلیم" ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم نہ تو وہ ہوگی جو اس وقت "اسلامیات" کے نام سے ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے اور نہ ہی وہ جس کا ما حصل ہمارے "علماء" ہوتے ہیں۔ اسکولوں میں جو کچھ دینیات کے نام سے پڑھایا جاتا ہے اس سے بچوں کے ذہن میں، دین کے متعلق چند رسومات اور توہم پرستیوں کے سوا اور کوئی تصور مرتسم نہیں ہوتا۔ باقی رہے ہمارے کالج (بلکہ یونیورسٹیاں)۔ سو ان میں اسلامی تعلیم کا نہج و اسلوب وہی ہے جسے کبھی مغربی مستشرقین نے متعین کیا تھا۔ اس سے (غلط یا صحیح) کچھ معلومات تو بہم پہنچ جاتی ہیں دین کی روح اور اس کی غرض و غایت کبھی سامنے نہیں آتی۔

اب رہے ہمارے مذہبی مدارس۔ سو وہاں کے فارغ التحصیل علماء حضرات کو اسلام کے متعلق کتنی واقفیت ہوتی ہے اس کا کچھ اندازہ آپ نے منیر کمیٹی، کی تحقیقات کے دوران میں لگا لیا تھا جب متعدد علماء سے پوچھا گیا تھا کہ "مسلمان کسے کہتے ہیں"۔ تو ان میں سے بعض نے تو کہہ دیا تھا کہ اس کا جواب فی الفور نہیں دیا جا سکتا۔ اور جنہوں نے جواب دیا تھا وہ اس کمیٹی کی رپورٹ کے اندراج بھی موجود ہے۔ جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ اس سلسلہ میں اگر مزید تجربہ کرنا ہو تو ان حضرات کی خدمت میں ایک سوالنامہ بھیج کر کیا جا سکتا ہے کہ "اسلام کسے کہتے ہیں اور اس کی غرض و غایت کیا ہے"۔ جوابات خود بتا دیں گے کہ ہمارے ان مکاتب اور دارالعلوموں میں اسلام کے متعلق کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ان مدارس کی غایت یہ ہے کہ طالب علموں کو فقہ کے کچھ مسائل بتا دیئے جائیں اور وہ بھی بالخصوص ایسے جن کا تعلق شخصی قوانین (Personal Laws سے ہو) اور کچھ کتابیں وعظ و نصیحت کی پڑھا دی جائیں تاکہ وہ مساجد کی امامت کے فرائض ادا کرسکنے کے قابل ہو جائیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ امامت کے فرائض سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ یا نماز جنازہ پڑھا دی جائے۔ جمعہ یا عیدین کا خطبہ دیدیا جائے یا نکاح پڑھا دیا جائے۔ جو علماء اس سے بلند درجہ پر ہوں وہ نکاح و طلاق کے متعلق فتویٰ دے سکیں۔ یا جو تقریر کرنی جانتے ہوں وہ دوسرے فرقہ کے علماء سے مناظرہ کرسکیں۔ باقی "نفس اسلام" تو وہ (مروجہ تعلیم کی رو سے) ان حضرات کے سامنے آ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ (جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے) حقیقی اسلام پر غیر اسلامی

تصورات ونظریات۔ معتقدات وخیالات کے اس قدر دبیز پردے پڑ چکے ہیں کہ ان کی موجودگی میں حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ نہیں سکتی۔ اور ان پردوں کو الگ کر دینا ان حضرات کے بس کی بات اس لئے نہیں کہ انھوں نے انہی پردوں کو اصل اسلام سمجھ رکھا ہے۔ یہ بعینہٖ وہ حالات تھے جن سے تنگ آ کر یورپ نے مذہب کو کلیسا کی چار دیواری تک محدود کر دیا اور دنیا کے معاملات اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق حل کرنے لگ گئے۔ جہاں تک مسئلہ زیر نظر یعنی تعلیم کا تعلق ہے یہی حالت ہمارے ہاں بھی ہے۔ یہاں "دینی" تعلیم، مذہبی مکاتب میں دی جاتی ہے۔ اور "دنیاوی تعلیم" اسکولوں اور کالجوں میں۔ اس اعتبار سے ہم میں اور اہل مغرب میں فرق یہ ہے کہ اس عملی ثنویت (Dualism) کے باوجود ہم ہر منبر اور اسٹیج سے ہمیشہ پکارتے رہتے ہیں کہ اسلام میں مذہب اور سیاست، روح اور مادہ۔ دین اور دنیا میں کوئی مغائرت نہیں۔ اس قسم کی ثنویت یکسر غیر اسلامی ہے۔

لہٰذا ہمارے ہاں تعلیم کے سلسلے میں سب سے پہلا قدم اٹھانے کا یہ ہے کہ "مذہبی اور دنیاوی تعلیم" کی اس ثنویت کو ختم کر دیا جائے۔ جب ہمارے ہاں دین اور دنیا میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں تو مذہبی اور دنیاوی تعلیم الگ الگ درسگاہوں میں کیوں دی جائے؟ ہماری ایک ہی درسگاہوں میں عصر حاضر کے جدید علوم کے ساتھ دین کی تعلیم دی جانی چاہیئے اور اس طرح مذہبی پیشوائیت (priesthood) کے ادارہ (Institution) کو ختم کر دینا چاہیئے۔ آپ غور کیجئے کہ یہ ادارہ اس وقت ملک اور قوم کو کس قدر نقصان پہنچا رہا ہے۔ آپ ملکی ترقی کے لئے جو تجویز پیش کریں گے ظاہر ہے کہ اسے سب سے پہلے اہل علم وبصیرت طبقہ (Intelligentsia) کے سامنے رکھا جائے گا۔ اس طبقہ کا یہ فریضہ ہو گا کہ وہ عوام کو ان تجاویز کے قبول کرنے اور عملی شکل دینے کے لئے ذہنی طور پر آمادہ کرے۔ لیکن ہمارے عوام (جو ملک کی آبادی کے تقریباً اسی نوّے فی صد پر مشتمل ہیں) مذہبی راہنماؤں (مولوی صاحبان) کے زیر اثر ہیں۔ مساجد ان حضرات کے پراپیگنڈے کے مستقل مراکز ہیں جہاں سے دن رات ہر نئی بات کے خلاف اور ہر جمود کے حق میں مسلسل آواز بلند ہوتی رہتی ہے۔ یہی وہ آواز ہے جو ملک کی اس قدر کثیر آبادی کا کوئی قدم ترقی کی طرف بڑھنے نہیں دیتی۔ جب تک یہ پیشوائیت موجود رہے گی ملک کا کوئی قدم ترقی کی طرف نہیں اٹھ سکے گا۔ ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ اگر مولوی صاحبان نہ رہے تو ہم نماز روزے کے مسائل کس سے پوچھیں اور نکاح وطلاق کے متعلق شرعی احکام معلوم کرنے کے لئے کس کی طرف رجوع کریں؟ ایک اسلامی مملکت میں ان مسائل اور احکام کے دریافت کرنے کے لئے کسی پرائیویٹ شخص کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ان تمام معلومات کا بہم پہنچانا خود حکومت کا فریضہ ہو گا جس کے لئے حکومت ضروری بندوبست کرے گی۔ یہ بندوبست بھی "پیشوائیت" کے انداز کا نہیں ہو گا۔ حکومت کے شعبۂ قوانین کے عمال یہ تمام معلومات بہم پہنچائیں گے۔ اس لئے کہ اس وقت ان معلومات کی حیثیت بھی قانونی ہوگی۔ شریعت کہتے ہی اسلامی مملکت کے قوانین کو ہیں جو قرآن کی روشنی میں مدوّن کئے جائیں۔

بہرحال تعلیم کے سلسلے میں کرنے کا پہلا کام یہ ہے کہ مذہبی اور دنیاوی تعلیم کی موجودہ ثنویت ختم کر کے اسکولوں اور کالجوں میں علوم حاضرہ کے ساتھ ساتھ دین کی ضروری تعلیم دی جائے اور اس طرح مذہبی پیشوائیت اور مذہبی درسگاہوں کا الگ سلسلہ ختم کر دیا جائے۔

اب رہا یہ کہ دین کی تعلیم کی اصل و بنیاد کیا ہو؟ سو اس کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ دین کی اصل و بنیاد خدا کی کتاب ہے جس پر ہر مسلمان کا ایمان ہے اور جو تمام مسلمانوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن ہی اس مقصد منتہیٰ کی وضاحت کرے گا جس کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ یہی بتائے گا کہ مسلمان کا فلسفۂ زندگی کیا ہے اور فریضۂ حیات کیا۔ اسی سے یہ متعین ہو گا کہ ملت اسلامیہ کا اقوام عالم میں مقام کیا ہے اور منصب کیا۔ یہی واضح کرے گا کہ مملکت پاکستان کا آئین کیسا ہونا چاہیئے اور قوانین کس قسم کے۔ یہی اس کی پالیسی کو معین کرے گا اور اسی سے وہ شاہراہ حیات پر راہنمائی حاصل کرے گی۔ اس سے آگے بڑھئے تو اسی سے وہ کیریکٹر پیدا ہو گا[1] جس کے فقدان کا ہم آج رونا روتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ قرن اول کے جن مسلمانوں کے سیرت وکردار کو ہم نوع انسانی کے لئے بطور معیار اور مثال پیش کرتے ہیں انھیں کس چیز کی تعلیم دی گئی تھی؟ انھیں نبی اکرم ؐ نے جو فقید المثال تعلیم دی تھی اسے خود کتاب اللہ نے ان چند الفاظ میں سمٹا دیا ہے کہ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۶۲/۲)۔ وہ قوانین خداوندی کو ان کے سامنے پیش کرتا ہے ان کی ذات کی نشوونما کا سامان فراہم کرتا ہے۔ انھیں کتاب وحکمت (قانون خداوندی اور اس کی غایت ومصلحت) کی تعلیم دیتا ہے۔ یہی وہ تعلیم قرآنی تھی جس نے اس اونٹ چرانے والی قوم کو اقوام عالم کی امامت (لیڈرشپ) کا اہل اور مستحق بنا دیا۔ قرآن وہ مستقل اقدار دیتا ہے جن کے احترام اور پابندی میں سیرت کی بلندی اور کردار کی پختگی کا راز پوشیدہ ہے۔ یہی مستقل اقدار وہ حدود ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے ہم اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے قوانین

---

[1] اس نکتہ کی وضاحت آئندہ اشاعت میں کی جائے گی

خود وضع کرنے کے مجاز قرار پاتے ہیں۔ انہی کے مطابق وہ معاشرہ متشکل ہوتا ہے جس میں اولاً اس معاشرہ کے افراد کی زندگی اور اس کے بعد پوری نوعِ انسانی کی زندگی، جنت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا ہماری تعلیم کی اصل واساس قرآن ہے۔

لیکن قرآنی تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ اسی کو حق و باطل اور صحیح اور غلط کا معیار قرار دیا جائے۔ ہماری تاریخ ہو یا سیرت، فقہ ہو یا روایات، سب کو قرآن کی روشنی میں پرکھا جائے۔ جو اس کے مطابق ہو اسے قبول کر لیا جائے۔ جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے۔ اس سے وہ غیر اسلامی پردے اٹھ سکیں گے جو ہماری بدقسمتی سے صدیوں سے حقیقی اسلام کو ہماری نگاہوں سے اوجھل کئے ہوئے ہیں۔ اور جب تک یہ پردے نہیں اٹھیں گے، ہم دین کو اس کی اصلی شکل میں کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے آج سے اکیس سال پہلے واضح الفاظ میں توجہ دلائی تھی۔ بات یوں ہوئی کہ سکندر حیات خاں (مرحوم) نے تجویز کیا کہ انجمن حمایت اسلام کی طرف سے علامہؒ کی خدمت میں ایک تھیلی پیش کی جائے۔ آپ نے اس تجویز کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ ملت کی ضروریات ایک فرد کی ضروریات سے کہیں زیادہ اہم ہیں! اس کے بجائے آپ نے کہا کہ اگر تم لوگوں نے کچھ کرنا ہے تو اسلامیہ کالج میں اسلامیات کی ریسرچ کے لئے ایک ادارہ قائم کرو۔ اس سلسلہ میں آپ نے فرمایا۔

> آج وقت کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ اسلامی فکر اور نہج زندگی کا ان کے حقیقی سرچشمہ کی روشنی میں مطالعہ کر کے قوم کو بتایا جائے کہ دین کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے اور کس طرح اس کے اہم تصورات و مباحث کا ان بے شمار تفریعی نہوں کے بوجھ کے نیچے دب کر گلا گھٹ رہا ہے جو اسلام کے ضمیر پر بُری طرح سے جم چکی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس غیر اسلامی تہ (crust) کو الگ کر دیا جائے تاکہ ہماری نئی نسل کے ضمیر کو آزادانہ فطری نمود کا موقع مل سکے۔ (گفتار و بیانات علامہ اقبالؒ صفحہ [illegible])

اس کام کی اہمیت جس قدر آج سے اکیس سال پہلے تھی، آج اس سے کہیں زیادہ اور شدید ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی فرد، ادارہ یا مملکت مسلمانوں کی حقیقی ہی خواہ اور نوعِ انسانی کی محسن ہوگی جو اسلام کو ان غیر اسلامی تصورات و نظریات کی زنجیروں سے آزاد کر کے اسے اپنی منزل تک پہنچنے کا موقع مہیا کرے گی۔ لیکن یہ کام اُس کے ہاتھوں سرانجام پائے گا جو تعصب و جہالت کی ہر یورش کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور جرأت رکھتا ہو۔ اس لئے کہ جامد قدامت پرست طبقہ ان غیر اسلامی تہوں (کو ہٹانا تو ایک طرف، انہیں) چھونے تک کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ان غیر اسلامی رسوم و تصورات کی تقدیس ان پرانی قبروں کی سی ہو چکی ہے جنہیں محض مرورِ زمانہ کی وجہ سے تقدیس حاصل ہو چکی ہو۔ ان قبروں کی مٹی کو ان کا کوئی متولی ہاتھ تک نہیں لگانے دیتا، چہ جائیکہ انہیں کھود کر دیکھا جائے کہ ان کے نیچے دفن کیا ہے؟ اسلام کو ان غیر اسلامی زنجیروں سے آزاد کرانا، کسی محکوم ملک کو غیروں کے تسلط و استبداد سے آزاد کرانے سے بھی زیادہ مشکل اور ہمت طلب مرحلہ ہے۔ لیکن اس کے بغیر ملک کی حالت میں کوئی صحیح اور پائیدار تبدیلی ہو نہیں سکتی اس لئے کہ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ ...... (۱۳/۱۱) کسی قوم کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی جب تک اس قوم کے افراد کے قلب و نگاہ میں تبدیلی نہ ہو اور یہ تبدیلی صحیح تعلیم کے بغیر ناممکن ہے۔

یہ ہے ہماری تعلیمی عمارت کا سنگِ بنیاد۔ اگر ہم نے فی الواقعہ ایسا تعلیمی نظام متشکل کرنا ہے جسے صحیح معنوں میں اسلامی کہا جا سکے تو اس کے لئے پہلا قدم یہی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز اس تعلیمی کمیشن کے حدود تحقیق و سفارشات سے باہر ہے جس کا تقرر حال میں کیا گیا ہے۔ اس کے لئے اسکے دائرۂ تحقیق کی توسیع یا کسی دوسرے کمیشن کے تقرر کی ضرورت ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا اور معاملہ موجودہ نظام کے نظم و نسق میں تغیر و تبدل اور اسکے ٹیکنیکل گوشوں میں اصلاح و ترقی تک محدود رکھا گیا تو (جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) اس سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکیں گے جن کی آرزو کے آئینہ دار محترم صدر مملکت کے وہ بیانات ہیں جن کے اقتباسات شروع میں زینتِ دو اوراق کئے گئے ہیں۔ ہم محترم صدرِ مملکت کی خدمت میں باادب لیکن بتاکید گذارش کریں گے کہ وہ قوم اور اسلام کی بنیادی ضرورت کو اپنی خصوصی توجہات کا مرکز بنائیں اور اس کے لئے ایسے اقدامات کریں جن سے وہ مقاصد حاصل ہو جائیں جن کا اظہار انہوں نے مختلف مواقع پر کیا ہے اور جن میں مملکت کی سربلندی اور اسلام کی سرفرازی کا راز پوشیدہ ہے۔ اگر انہوں نے تعلیم کے مسئلہ کو ان خطوط پر سلجھا دیا تو بلاشک و شبہ جریدۂ عالم پر ان کا دوام ثبت ہو جائے گا اور قرطاسِ زمانہ پر ان کا نام سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا۔

مجلسِ اقبال

مثنوی رموزِ بیخودی

در معنیِ ایں کہ جمعیتِ حقیقی از محکم گرفتنِ نصب العینِ ملیہ است و نصب العینِ اُمتِ محمدیہ حفظ و نشرِ توحید است۔

زیرِ نظر باب میں حضرت علامہ اس حقیقت کو سامنے لاتے ہیں کہ اگر انسان کے سامنے کوئی مدعا، کوئی مقصد، کوئی نصب العین نہ ہو تو اس کی ساری زندگی بے معنی ہو جاتی ہے۔ زندگی میں نظم و ضبط مدعا سے پیدا ہوتا ہے۔ پھر جس قسم کا وہ مدعا ہوگا اسی قسم کی انسان کی زندگی ہوگی۔ افراد کی طرح یہی حالت اقوام کی بھی ہے۔ قوموں میں بھی حقیقی اجتماعیت اشتراک مدعا سے ہوتی ہے۔ ملتِ اسلامیہ کا نصب العین حیات یا مدعائے زندگی، حفظ و نشرِ توحید ہے۔ یہ ایک عظیم اور جامع حقیقت ہے جس کا اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ توحید سے عام طور پر مفہوم صرف یہ لیا جاتا ہے کہ اللہ کو ایک مانا جائے۔ یہ درست ہے لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ خدا کو ایک ماننے سے مقصود کیا ہے؟ توحید کے معنی یہ ہیں کہ کائنات میں صرف ایک قانون نافذ العمل ہے، جسے قانون خداوندی کہتے ہیں۔ اسی طرح انسانی دنیا میں بھی ایک ہی قانون اور ایک ہی ضابطۂ حیات ہونا چاہیے جس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ یہ قانون خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے ملا اور اب قرآن کے دفتین میں محفوظ ہے۔ اس قانون کو تمام نوعِ انسان کا ضابطۂ زندگی بننا چاہیے۔ اسی ضابطۂ قانون کی حفاظت اور نشر و اشاعت، اُمتِ مسلمہ کا نصب العین حیات ہے۔

مقصدِ پیشِ نظر کو علامہ اقبال پہلے ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانی کلام، حروف و الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اگر بولنے والے کے ذہن میں کوئی مقصد اور کوئی مدعا ہو تو ان حروف و الفاظ میں ربط پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح یہ کلام بامعنی بن جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کے ذہن میں کوئی مدعا نہ ہو تو یہ حروف و الفاظ بے ربط لہٰذا بے معنی ہو جاتے ہیں۔ یہی کیفیت پوری کی پوری

کائنات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں

با تو آموزم زبانِ کائنات　　　حرف و الفاظ است اعمالِ حیات
چوں ز ربطِ مدعائے بستہ شد　　　زندگانی مطلعِ برجستہ شد

آؤ تمہیں زبانِ کائنات سکھاؤں۔ زندگی کے تمام اعمال کی مثال حروف و الفاظ کی ہے۔ اگر وہ مدعا کے رشتے سے وابستہ ہیں تو ان میں باہمی ربط پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح انسانی زندگی ایک "مرصع غزل" کا حسین اور برجستہ مطلع بن جاتا ہے۔ لیکن اگر افراد کے سامنے کوئی مشترکہ مقصد نہ ہو، تو ان کے اعمال منتشر الفاظ و حروف کی طرح بے معنی اور بے نتیجہ رہ جاتے ہیں۔

مدعا گردد اگر مہمیزِ ما
ہمچو صرصر می رود شبدیزِ ما

اگر مدعا ہماری زندگی کا جذبۂ محرکہ بن جائے تو پھر دیکھئے کہ ہمارے عمل کی رفتار کس قدر تیز ہو جاتی ہے۔

مدعا راز بقائے زندگی
جمع سیماب قوائے زندگی

زندگی کی بقا کا راز مدعا میں ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو زندگی کی قوتیں پارے کی طرح مضطرب و بے قرار اور منتشر و پریشان رہیں۔

چوں حیات از مقصدے محرم شود
ضابطہ اسباب ایں عالم شود

جب زندگی اسباب سے روشناس ہو جاتی ہے تو وہ کائنات کے مختلف اسباب و علل میں ایسا ضبط پیدا کر لیتی ہے جس سے یہ تمام اسباب (causes) اپنے صحیح نتائج (Effects) پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔

خویشتن را تابع مقصد کند
بہر او چیند۔ گزیند۔ رد کند

جب زندگی مقصد کے تابع ہو جاتی ہے تو وہ ہر شے کو اسی نقطۂ خیال سے پرکھتی۔ چنتی۔ پسند کرتی اور رد کرتی ہے کہ کونسی چیز اس مقصد کے لئے ممد و منفعت بخش ہے اور کونسی اس کے لئے مضرت رساں۔ یعنی اس کے نزدیک خیر و شر اور رد و قبول کا معیار، مقصد کا نفع اور نقصان ہو جاتا ہے۔

ناخدا را ایم روی از ساحل است
اعتبارِ جادہ ہا از منزل است

جب ملاح اپنی کشتی کو سمندر میں کھیتا ہے تو کشتی کا رخ ہمیشہ اس ساحل کی طرف رکھتا ہے جس کی طرف اس نے جانا ہوتا ہے۔ جب کوئی مسافر گھر سے نکلتا ہے تو مختلف راستوں میں سے اپنے لئے وہ راستہ منتخب کرتا ہے جو اسے اس کی منزل کی طرف

سے جائے۔ جب زندگی ایک مدعا کو اپنا لیتی ہے تو اس کا ساحلِ مراد اور منزلِ مقصود وہ مدعا ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ انہی رستوں کو اختیار کرتی ہے جو اسے اس منزل کی طرف لے جائیں۔

درولِ پروانہ داغ از ذوقِ سوز
طوفِ او گردِ چراغ از ذوقِ سوز

پروانہ شمع کے گرد کیوں چکر لگاتا ہے؟ وہ کیوں جل کر اپنے آپ کو راکھ بنا لیتا ہے؟ محض اس لئے کہ جلنے کی "لذت" اس کی زندگی کا مدعا ہے۔

قیس اگر آوارۂ صحراستے — مدعایش محملِ لیلاستے
تا بود شہر آشنا لیلائے ما — بر نخیزد بعصراپائے ما

جنوں اگر صحرا میں پھرتا رہتا ہے، تو اس لئے نہیں کہ صحرا کی آب و ہوا اسے راس آتی ہے بلکہ اس لئے کہ اسے محملِ لیلا کی تلاش ہوتی ہے اور وہ جانتا ہے کہ لیلیٰ صحرا میں ملے گی۔ اگر لیلیٰ شہر میں ہو تو ہمارے قدم کبھی صحرا کی طرف نہ اٹھیں اس لئے کہ مقصود تو حصولِ لیلے ہے نہ کہ صحرا یا شہر کی سکونت۔

ہمچو جاں مقصود پنہاں در عمل
کیف و کم از وے پذیرد ہر عمل

جس طرح جسم کے اندر جان پنہاں ہوتی ہے اسی طرح ہر عمل کی جان وہ مقصد ہوتا ہے جس کی خاطر وہ عمل ظہور میں آتا ہے۔ عمل کی کمی بیشی۔ تیزی اور سستی سب اس مقصد کی نسبت سے متعین ہوتی ہے جس کی خاطر وہ عمل وجود پذیر ہوتا ہے۔

گردشِ خونے کہ در رگہائے ماست
تیز از سعیِ حصولِ مدعا است

جس قدر ہم اپنے مقصد کے حصول کی خاطر سعی و کاوش کریں گے اسی نسبت سے ہماری رگوں میں خون کی گردش ہوگی۔ بالفاظِ دیگر زندگی کی حرکت، مقصد اور اس کے حصول کے لئے سعی و عمل سے متعین ہوتی ہے۔

از تفِ او خویش را سوزد حیات
آتشیں چوں لالہ اندوزد حیات

زندگی، مدعا کی حرارت سے اپنے آپ کو جلاتی ہے اور اس حرارت کو لالہ کی طرح جمع کر کے رکھتی ہے۔ تاکہ اس سے ایک جہانِ نو کی تعمیر کر سکے۔

مدعا مضرابِ سازِ ہمت است
مرکزے کو جاذبِ ہر قوت است

مدعا وہ زخمہ ہے جس سے ہمت کے ساز میں چھپے ہوئے نغمے بیدار ہوتے ہیں۔ یہی وہ مرکز ہے جو کائنات کی منتشر قوتوں کو اپنی طرف کھینچے رکھتا ہے۔

دست و پائے قوم را جنباند او
یک نظر صد چشم را گرداند او

قوم کے ہاتھ پاؤں میں حرکت مدعا سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جو مختلف افراد کی نظروں میں یک رنگی پیدا کر دیتا ہے۔ اس سے قوم میں وحدت فکر و نظر پیدا ہوتی ہے۔

شاہد مقصود را دیوانہ شو
طائف ایں شمع چوں پروانہ شو

مدعا و مقصد کی اس اہمیت کے پیش نظر تمہیں چاہیئے کہ پروانے کی طرح اس شمع کا طواف کرو اور دیوانے کی طرح اس کے حصول میں سرگرداں رہو۔

خوش نوائے نغمہ ساز قُم زد است　　زخمۂ معنی بر ابریشم زد است
تا کشد خار از کف پا رہ سپر　　می شود پوشیدہ محمل از نظر
گر بعد در یک نفس غافل شدی　　دور صد فرسنگ از منزل شدی

اس حقیقت کو جو اوپر بیان کی گئی ہے (مشہور شاعر) ملک قمی نے بڑے ہی لطیف انداز سے بیان کیا ہے جب اُن نے کہا ہے کہ

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

اگر ان کی نگاہوں سے اس کا مقصد ایک لمحہ کے لئے بھی اوجھل ہو جائے تو اس کی منزلِ مقصود اتنی دور چلی جاتی ہے کہ سو سال میں بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا۔

اس تمہید کے بعد حضرت علامہ اپنے موضوع کے دوسرے گوشے کو سامنے لاتے ہیں۔

ایں کہن پیکر کہ عالم نام اوست
ز امتزاجِ اُمّہات اندامِ اوست

یہ مادی کائنات کہ جس کا وجود مختلف عناصر کے اختلاط سے ترتیب پاتا ہے۔ اس کا طریق کار یہ ہے کہ وہ اپنے سامنے ایک مقصد رکھتی ہے۔ پھر اس مقصد کے حصول کے لئے وہ عناصر کو مختلف گردشیں دیکر منزل بہ منزل آگے بڑھاتے ہیں جاتی ہے تا آنکہ اس کی تدبیر (scheme) وہ نیا پیکر اختیار کر لیتی ہے جسے وجود میں لانا اس کے پیش نظر تھا۔

صد نیستاں کاشت تا یک نالہ رُست

صد چمن خوں کرد تا یک لالہ رُست

اس کی ارتقائی سعی و کاوش کی حالت یہ ہے کہ وہ سینکڑوں نیستاں کاشت کرتی ہے تاکہ ان میں آخرالامر وہ نے پیدا ہو جو ارژدی کی تمثیلی داستان میں نالہ و فغاں سے وضائے کائنات میں ارتعاش پیدا کر دے۔ وہ سینکڑوں گلستانوں کا خون کر دیتی ہے تاکہ ان میں ایک لالہ پیدا ہو۔

نقش ہا آورد و افگند و شکست

تا بلوحِ زندگی نقشِ تو بست

تمہیں کیا معلوم کہ اسے زندگی کو انسانی پیکر تک پہنچانے کے لیے، کتنی مختلف انواع (Species) کی تخلیق کرنی پڑی ان میں سے کس کس کو مٹایا اور کس کس کو آگے بڑھایا اور اس میں کتنا عرصہ دراز لگ گیا۔

نالہ ہا در کشتِ جاں کارید است

تا نوائے یک اذاں بالیدہ است

انسان کی طبعی ساخت کے بعد معنوی دنیا کی طرف آیئے۔ وہاں بھی یہی سلسلۂ ارتقا نظر آئے گا۔ انسان کے ذوقِ تجسس نے نہ معلوم کتنی صحرا نوردیاں اور دشت پیمائیاں کیں جو وہ آخرالامر حقیقت تک پہنچا۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک وحیٔ خداوندی کا تعلق ہے اس نے پہلے دن ہی حقیقت کی نقاب کشائی کر دی۔ لیکن ایک تو وحی کا اندازِ انہام ذہنِ انسانی کی پختگی کے ساتھ بدلتا رہتا تھا۔ دوسرے اس مقام پر علامہ اقبال درحقیقت انسان کی تلاشِ حقیقت کی اُس کاوش کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو وہ عقل کے تجرباتی طریق کی رو سے کرتا رہا ہے۔

مدتے پیکار با احرار داشت | با خداوندانِ باطل کار داشت
تخمِ ایماں آخر اندر گل نشاند | با زبانت کلمۂ توحید خواند

ایک مدت تک انسان کی کیفیت یہ رہی کہ وہ باطل کے خداؤں کا ساتھ دے کر حق پرستوں کے خلاف نبرد آزما رہا۔ حق و باطل کی یہ کشمکش ہزارہا سال تک جاری رہی۔ تا آنکہ ایمان کا تخم انسانی ضمیر میں بویا جا سکا۔ اور تمہاری زبان پر کلمۂ توحید آیا۔ یعنی زندگی کو اس آخری مقصود تک پہنچنے میں ہزاروں سال لگ گئے۔ یہ ہے وہ توحید جس کی کیفیت یہ ہے کہ

نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ

انتہائے کارِ عالم لا الٰہ

توحید دنیا کے مختلف دائروں کا نقطہ اور کائنات کا منتہائے مقصود ہے۔

چرخ را از زورِ او گردندگی | مہر را پائندگی رخشندگی

آسمان اسی کے زور سے گردش میں ہے۔ سورج کو اسی سے تابندگی اور روشنی ملتی ہے۔ اگر کائنات ایک لمحہ کے لئے قانون خداوندی کے علاوہ کسی اور کے قانون کے تابع چلنے لگ جائے تو یہ عظیم القدر سلسلہ ایک ثانیہ میں تہس نہس ہو کر رہ جائے۔

بحر گوہر آفرید از تاب او

موج در دریا تپید از تاب او

یہ قانون خداوندی کے اتباع کا نتیجہ ہے کہ سمندر گوہر درخشندہ پیدا کرتا ہے اور موجیں دریا میں تڑپتی۔ مچلتی دکھائی دیتی ہیں۔

خاک از موج نسیمش گل شود

مشت پر از سوز او بلبل شود

یہ قانون خداوندی کی موج نسیم کا صدقہ ہے کہ بے جان و بے کیف مٹی، رنگ و بو کا پیکر (پھول) بن جاتا ہے۔ اور یہی کارشمہ ہے کہ ایک مشت پر تپش و خلش اور سوز و گداز کے مجسمے (بلبل) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

شعلہ در رگ ہائے تاک از سوز او

خاک مینا تابناک از سوز او

یہ اس قانون کا تصدق ہے کہ انگور کی رگوں میں آتش سیال، خون زندگی بن کر دوڑتی ہے اور صراحی کی مٹی میں چمک اور دمک پیدا ہو جاتی ہے۔

نغمہ ہائش خفتہ در ساز وجود

جویدت اے زخمہ ور ساز وجود

انسانی پیکر میں بھی اسی قانون خداوندی کے نغمات پوشیدہ ہیں۔ یہ اپنی نمود کے لئے ایک زخمہ ور کی تلاش میں ہیں۔ اے مرد مسلمان تو ہی وہ مضراب زن ہے جس کی انہیں تلاش ہے

صد نوا داری چو خون در تن رواں

خیز و مضرابے بہ تار او رساں

اس ساز میں سینکڑوں نغمات اس طرح رواں دواں ہیں جس طرح رگ حیات میں خون زندگی۔ اے مرد مومن! تو اٹھ اور اس کے تاروں کو اپنے مضراب یقین و عمل سے چھیڑ اور پھر دیکھ کہ اس نغمات سے کیف و رنگ میں کس قسم کی رنگینیاں پیدا ہوتی ہیں۔

زانکہ در تکبیر راز بود تست

حفظ و نشر لا الہ مقصود تست

تیری ہستی کا راز اس میں ہے کہ تو اس قانون خداوندی کو اس طرح عملاً نافذ کرے کہ یہ قانون انسانوں کے تمام خود ساختہ قوانین کو

غالب آجائے (تکبیر کے یہی معنی ہیں) یہی تیری ہستی کا جوہر۔ اور یہی تیری زندگی کا مقصود ہے۔

تا نہ خیزد بانگِ حق از عالمے
گر مسلمانی نیاسائی دمے

جب تک دنیا میں حق کی آواز بلند نہ ہو جائے، اگر تو مسلمان ہے تو تجھے، ایک ثانیہ کے لئے بھی چین سے نہیں بیٹھنا چاہیئے۔

می ندانی آیۂ ام الکتاب　　　امتِ عادل ترا آمد خطاب
آب و تابِ چہرۂ ایام تو　　　در جہاں شاہد علی الاقوام تو

قرآن میں ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (اور ہم نے اس طرح تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا ہے تاکہ تم تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرو) اس لئے دنیا میں مسلمان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ حق کا علمبردار رہے اور دیکھے کہ نظامِ عالم حق و صداقت کے مطابق چل رہا ہے۔

نکتہ سنجاں را صلائے عام دہ
از علومِ امیّ پیغام دہ

تجھے چاہیئے کہ دنیا بھر کے اربابِ فکر و نظر کو حق کی دعوت دے اور انہیں ان علوم کا سبق دے جن سے نبی اُمّی نے دنیا کو روشناس کرایا تھا

امیّ پاک از ہوی گفتارِ او
شرحِ رمزِ ما غویٰ گفتارِ او

وہ اُمّی کریم جس کے پیغام (وحیِ خداوندی) میں اس کے ذاتی جذبات کی آمیزش تک نہ تھی۔ وہ نہ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ نہ کبھی بے راہ ہوا تھا۔ اس پر قرآن کی شہادت موجود ہے جس نے کہا ہے کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى اور مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى (سورۃ النجم)

تا بدست آورد نبضِ کائنات　　　وا نمود اسرارِ تقویمِ حیات
از قبائے لالہ ہائے ایں چمن　　　پاک شست آلودگیہائے کہن

حضور نبی اکرمؐ نے پہلے باطل کے تمام نظریات و معتقدات کو، جو زمانہ دراز سے متوارث چلے آ رہے تھے، صفحۂ ہستی سے مٹایا (یہ حصہ لا الٰہ کا تھا)۔ اور اس کے بعد صحیح تصوراتِ حیات کو رائج کیا (یہ حصہ اِلَّا اللہ کا تھا)۔ اس طرح آپ نے نبضِ کائنات پر اپنی انگلیاں رکھیں اور مناسب تدابیر سے، آہستہ آہستہ، اسرارِ حیات کو ایک ایک کر کے واشگاف کرتے چلے گئے۔

در جہاں وابستۂ دینش حیات
نیست ممکن جز بآئینش حیات

دنیا میں زندگی اسی ضابطۂ قوانین سے وابستہ ہے جسے نبی اکرمؐ نے پیش کیا اگر اس ضابطہ کو ہاتھ سے چھوڑ دیا جائے تو پھر کسی قوم

سکے سے زندہ رہنا ممکن نہیں

اے کہ می داری کتابش در بغل
تیز تر نہ پا بہ میدانِ عمل

تم مسلمان ہو۔ قرآن تمہاری بغلوں میں ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ میدانِ عمل میں تیز رفتاری سے آگے بڑھو۔

فکرِ انساں بت پرستے بت گرے
ہر زماں در جستجوئے پیکرے

باز طرحِ آزری انداخت است
تازہ تر پروردگارے ساخت است

عقلِ انسان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ اپنی پرستش کے لئے ہر زمانے میں ایک نیا بت تراشتی ہے۔ اس نے اپنی اس روش کے مطابق ہمارے زمانے میں بھی بت تراشی کی ہے اور ایک نیا دیوتا وضع کیا ہے

کاید از خوں ریختن اندر طرب
نام او رنگ است وہم ملک و نسب

یہ دیوتا۔ یہ تازہ ترین "خدا"۔ کون ہے؟ یہ ہے وطنیت کا بت۔ قومیت کا بت۔ بیعت۔ رنگ۔ نسل۔ وطن کی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کا نظریہ۔ اس بت کی کیفیت یہ ہے کہ یہ (کالی دیوی کی طرح) خوں ریزی سے بہت خوش ہوتا ہے۔

آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند
پیشِ پائے ایں بتِ ناارجمند

زمانۂ قدیم میں بتوں کے حضور انسانوں کی قربانی ہوتی تھی (اب بھی بعض مقامات پر ایسا ہوتا ہے) لیکن یہ تازہ ترین بت ایسا ہے جس کے استھان پر آدمی نہیں بلکہ خود آدمیت قربان کی جاتی ہے۔

اے کہ خوردستی ز مینائے خلیل
گرمیٔ خونت ز صہبائے خلیل

بر سرِ ایں باطلِ حق پیرہن
تیغِ لاموجودَ الّا ھو بزن

اے امتِ مسلمہ! تو اس ملتِ ابراہیمی کی پیامبردار ہے جس نے خون اور وطن کے رشتوں کو منقطع کرکے، خالص دین کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کی تھی۔ جس نے باطل کے خداؤں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا۔ تیرا فریضہ یہ ہے کہ تو لا الٰہ الا اللہ کی ضرب کاری سے اس بتِ عہدِ حاضر کو پاش پاش کر دے۔

جلوہ در تاریکیٔ ایام کن
آنچہ بر تو کامل آمد عام کن

تیرے پاس دین کامل ہے۔ تو اٹھ اور اس دین کے سراجاً منیراً سے دنیا کی تاریکی کو دور کر دے۔

لرزم از شرمِ تو چوں روزِ شمار
پرسدت آں آبروئے روزگار

حرفِ حق از حضرتِ ما بردہ‌ئی
پس بپایانِ دیگراں نسپردہ‌ئی

جب میں اس کا تصور کرتا ہوں تو شرم سے کانپ اٹھتا ہوں کہ جب روزِ حشر خدا کرم تم سے یہ سوال کریں گے کہ قرآن کا جو پیغام تم نے مجھ سے لیا اسے باقی دنیا تک کیوں نہیں پہنچایا۔ تو تم اس کا کیا جواب دوگے؟ تمہارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔ اس وقت جو تمہاری حالت ہوگی اس کے تصور و احساس سے میں پانی پانی ہوجاتا ہوں۔ اس لئے تم اپنے فریضہ (نشر و اشاعت توحید) کی ادائیگی کرو تاکہ اس وقت کی ندامت و خجالت سے بچ جاؤ۔

اس شعر پر اس باب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

علامہ اقبال نے

جو کچھ سمجھا قرآن سے سمجھا اور جو کچھ سمجھایا قرآن سے سمجھایا

اس اجمال کی تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیے

اقبال اور قرآن

قیمت ---------- دو روپے

ملنے کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

تفسیر المنار

قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور تمام نوعِ انسانی کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس کے حقائق زمانے کے علم اور تجربے کے ساتھ بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ہر دور کے انسان کو دعوتِ غور و فکر دی گئی ہے۔ تدبر فی القرآن سب سے پہلی اور بنیادی شرط ہے جس سے قرآنی حقائق سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اسی کا نام قرآن کی تفسیر ہے۔

ہمارے دور کی متعدد تفاسیر میں سے ایک "تفسیر المنار" ہے۔ یہ عربی زبان میں ہے اور مصر سے شائع ہوئی ہے۔ اپنی گوناگوں خوبیوں کے اعتبار سے یہ تفسیر بڑی اہمیت رکھتی اور علمی طبقہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے کون نہیں جانتا کہ سید جمال الدین افغانیؒ کا ملتِ اسلامیہ کے دینی اور اجتماعی شعور کو بیدار کرنے میں کتنا عظیم حصہ ہے۔ انہی کا فیض صحبت و ارشاد تھا جس نے مصر میں مفتی امام الشیخ محمد عبدہ جیسا وسیع النظر صاحب فکر و عمل پیدا کیا۔ انھوں نے قوم کو قرآن کی طرف بلایا اور اسے جدید علوم کی روشنی میں، قرآنی حقائق سے آگاہ کیا۔ ان کی اس کوشش میں ان کے شاگرد رشید، سید محمد رشید رضا بھی شامل تھے۔ (اگرچہ وہ اپنے استاذ کے مقام تک نہیں پہنچ سکے تھے) انھوں نے اپنے استاد (مفتی محمد عبدہ) کے دروس قرآن کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کیا۔ یہی تفسیر "المنار" کے نام سے مشہور ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ تفسیر گویا علامہ افغانی، مفتی عبدہ اور سید رشید رضا رح کی قرآن فہمی کا مجموعہ ہے۔ (اس میں اگر سید رشید رضا اپنے فہم قرآن کو شامل نہ کرتے تو تفسیر کا پایہ بہت بلند رہتا)

افسوس ہے کہ یہ تفسیر مکمل نہ ہو سکی۔ صرف سورہ یوسف تک بارہ جلدوں میں لکھی جا سکی۔ لیکن اس میں بہت سے حقائق ایسے آگئے ہیں جو فہم قرآن میں بڑے ممد و معاون ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ یہ تفسیر عربی زبان میں ہے اس لئے اردو خواں حضرات اس سے استفادہ سے محروم رہ گئے ہیں۔ ان کے فائدے کے پیش نظر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس تفسیر کے چیدہ چیدہ نکات کا ترجمہ طلوع اسلام میں شائع کیا جائے۔ زیر نظر اشاعت میں اس کے مقدمہ اور سورۂ فاتحہ کی شرح سے چند ایک مقامات کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ امید ہے قارئین اس سلسلہ کو مفید اور دلچسپ پائیں گے۔

(۱) مقدمہ تفسیر "المنار" سے

قرآن مجید کن امور سے بحث کرتا ہے

قرآن مجید نہ دنیوی حکام کے قوانین کی قسم کا خشک قانون بنا کر اتارا گیا ہے نہ وہ جسمانی امراض کے معالجہ کے لئے طبی کتاب ہے۔ نہ حوادث و وقائع پر مشتمل انسانی تاریخ ہے، نہ دولت کمانے اور صنعتوں کے حاصل کرنے کے لئے وہ کوئی فنی کتاب ہے، کیونکہ یہ تو وہ امور ہیں جنہیں انسانی صلاحیتیں اپنی محنت و تجربات سے معلوم کر سکتی ہیں اور ان کا وحی الٰہی پر دار و مدار نہیں (صفحہ)

یہ انسان کی ذات کی اصلاح کرتا ہے، اور جب انسان، جو زمین کی طاقتوں کا مالک ہے، اپنی ذات کی اصلاح کر لیتا ہے تو وہ نہایت تیزی سے دنیوی ترقیوں کے مراحل طے کر لیتا ہے۔ اس مضمون کو ایک حکیم یورپ نے اپنی کتاب "قوموں کا ارتقاء" میں ان الفاظ سے بیان کیا ہے:-

> کسی قوم میں فنون کا ملکہ تین نسلوں سے پہلے راسخ نہیں ہوتا۔ پہلی نسل تقلید کرتی ہے۔ دوسری نسل بین بین ہوتی ہے۔ اور تیسری نسل مکمل آزادی سے متمتع ہوتی ہے۔ لیکن ان مراحل کو جس قوم نے غیر معمولی اور خلاف قاعدہ طریق سے، ایک ہی نسل میں عبور کر لیا وہ عرب ہیں جن میں ایک ہی نسل میں فنون کا ملکہ راسخ ہو گیا۔

ہمارا تجربہ

یہ اس لئے کہ تربیت و اصلاح ذات کے بغیر علوم و فنون بھی غلامی کے آلہ کار بن جاتے ہیں، اور ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایک پڑھا لکھا سمجھدار فن کار جب وزیر بنا دیا جاتا ہے تو اس کو سب سے پہلے جو فکر دامنگیر ہوتی ہے وہ اپنے اور اپنی اولاد کے تعیش و آسائش کے لئے وسیع پیمانے پر دولت کی فراہمی ہوتی ہے۔ یہ برسر اقتدار طبقہ کا شیوہ بن جاتا ہے۔ وہ قوم کی تمام دولت کو رشوتوں، دیگر حیلوں اور دیگر حرام خوریوں سے ختم کر دیتے ہیں۔ قوم کو جو کچھ ملتا ہے وہ اتنا ہی ہوتا ہے جو ان کی عیش کوشیوں سے بچ رہے۔ یعنی اتنا ہی جتنا اسے غیر ملکی اقتدار کی غلامی میں ملتا تھا۔ (صفحہ)

تفسیر قرآن کی راہ میں حائل ہونے والے حجابات

مسلمانوں کی بدنصیبی ہے کہ تفسیر قرآن کے نام سے اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا بڑا حصہ قرآن کے مقاصد عالیہ و ہدایت سامیہ کے حصول کی راہ میں روک بن گیا ہے، مثلاً ایک حجاب صرفی و نحوی قواعد اعراب کے مباحث ہیں۔ دوسرا حجاب فن معانی بیان کے نکتے اور ان فنون کی اصطلاحات ہیں۔ تیسرا حجاب متکلمین کی مناظرانہ بحثیں ہیں۔ چوتھا حجاب اصولیوں کے تخریجات ہیں۔ پانچواں حجاب مقلد فقہا کے استنباطات ہیں۔ چھٹا حجاب متصوفین کی تاویلات ہیں۔ ساتواں حجاب مختلف مذاہب اور فرقوں کے تعصبات ہیں۔ آٹھواں حجاب کثرت روایات کی آمیزش ہے۔ نواں حجاب اسرائیلی خرافات کا امتزاج ہے۔ ان حجابات میں جو رہی سہی کسر تھی اسے امام رازی نے اپنے زمانہ میں پیدا ہونے والے علوم ریاضی، طبیعی، یونانی علم ہیئت و فلکیات کے اضافہ سے پورا کر دیا۔ اسی کی تقلید میں آج ہمارے زمانہ کے بعض مفسرین نے

اپنے جدید علوم و فنون کو جزو تفسیر بنا ڈالا ہے۔ امام رازی کا طریقہ یہ ہے کہ وہ آیت کی تفسیر کے ذیل میں مفرد الفاظ (مثلاً ارض، سیارہ وغیرہ) لیکر علوم فلکیات و حیوانات و نباتات سے فصلوں پر فصلیں لکھتے چلے جاتے ہیں جو قرآن پڑھنے والے کو ان مقاصد سے دور کر دیتی ہیں جن کے لئے قرآن نازل کیا گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ فہم قرآن کے وسائل میں فنون عربیہ، قواعد و اصطلاحات اصول جن کا قرآن فہمی سے خاص تعلق ہے (مثلاً نحو و معانی کے قواعد) نیز کائنات اور اس میں اللہ تعالیٰ کے قوانین کے جاری و ساری ہونے کا علم ضروری ہے (لیکن نہ اس حد تک کہ یہی چیزیں تفسیر کا بنیادی موضوع بن جائیں)۔

روایات اور تفسیر قرآن

رہیں وہ روایات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور علماء تابعین سے تفسیر میں منقول ہیں تو ان میں بعض تو ضروری ہیں۔ کیونکہ جس روایت کے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اس پر کسی دوسرے خیال کو ترجیح نہیں دی جائے گی۔[1] اس کے بعد تمام صحابہؓ کے اقوال کی باری آتی ہے جو لغوی شرح یا ان کے دور کے عمل کے متعلق کچھ بتاتے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں منقولہ احادیث روایات میں صحیح بہت کم ہیں۔ اس قسم کی منقولہ تفسیر کا بڑا حصہ بقول علامہ ابن کثیر یہودیوں، اسرائیلیوں اور اہل کتاب میں سے مسلمان ہو جانے والوں کی اپنی آمیزشوں کا نتیجہ ہے، اور اس قسم کی آمیزشوں کا بیشتر حصہ رسولوں اور ان کی قوموں کے قصوں، ان کی کتابوں اور ان کے معجزات سے متعلق ہے۔ یا ان کے علاوہ دوسروں کی تاریخ سے متعلق۔ مثلاً اصحاب کہف، شہر ارم، ذات العماد، سحر بابل اور عوج بن عنق سے متعلق۔ یا امور غیب، قیامت کی علامات، شرائط قیامت کے حوادث اور مابعد قیامت سے متعلق احوال سے متعلق۔ ان چیزوں کے متعلق تفاسیر کا تقریباً تمام تر حصہ خرافات و مفتریات ہے جسے راویوں کی تصدیق حاصل ہو گئی۔ حتیٰ کہ بعض صحابہ کرامؓ کی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا۔

تین چیزوں کی قطعاً کوئی اصل و سند نہیں ہے۔ (۱) تفسیر (۲) ملاحم (۳) مغازی۔ (رسعت و صحت)

دلبرا خطا اینجا است

قرآن کی تفسیر کے سلسلہ میں وہ مقامات جہاں غلطیاں کی جاتی ہیں ان کی دو شکلیں بنتی ہیں۔

(۱) اپنی تائید کے لئے قرآنی الفاظ کے معانی اپنے عقیدہ کے مطابق وضع کر لینا۔ جیسا کہ عام طور پر مختلف فرقوں کے مقلدین اور متفرق مذاہب کے حامی اور ان کے متعصب پیروؤں کا شعار ہے۔ اس قسم کے لوگ اپنے معتقدات و مذاہب کو اصل ٹھیراتے ہیں اور قرآن کو اس کی فرع بنا کر اس سے اپنی تائید کا کام لیتے ہیں۔ یہ بدترین قسم کی بدعت ہے اور تفسیر القرآن بالرائے کی وہ مذموم شکل جس کی ممانعت حدیث میں وارد ہوئی ہے۔

(۲) قرآن مجید کے نازل کرنے والے (اللہ عزوجل) کے مقاصد کو ملحوظ رکھے بغیر۔ نیز جس پر یہ نازل ہوا اور جو اس کا

---

[1] جس طریق سے احادیث کے مجموعے مرتب ہوئے ہیں اس کے پیش نظر کسی حدیث کے متعلق بھی یہ ثابت ہونا ممکن ہے کہ اسے رسول اللہؐ نے ویسے ہی فرمایا تھا۔ لہٰذا حدیث کے صحیح تسلیم کئے جانے کی ایک ہی شکل رہ جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ قرآن کے خلاف نہ ہو۔ خود علامہ رشید رضا نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔ دیکھئے زیر نظر مقالہ کا آخری حصہ (طلوع اسلام)

مطلب تھا اس کی پروا کئے بغیر محض عربی لغت کی دلالت سے تفسیر کرنا۔ (صفحہ ۹)

کثرتِ روایات خود قرآن سے حجاب ہیں

تفسیر کے سلسلہ میں جو کچھ روایتاً بیان کیا گیا ہے ان کا اکثر بیشتر حصہ قرآن کی راہ میں حجاب ہے جو تلاوتِ قرآن کرنے والے کو اس کے بلند مقاصد سے ہٹا دیتا ہے۔ وہ بلند مقاصد جو انسانی ذات کو نشو و نما دیتے اور عقل کو نور بخشتے ہیں۔ جو لوگ منقولہ روایات پر مشتمل تفسیر قرآنی کو ترجیح دیتے ہیں ان کے لئے قرآن فہمی کی راہ میں خود کثرتِ روایات حجاب بن جاتی ہیں۔

تفسیرِ قرآن اور اس سے ہمارا مقصد

تفسیرِ قرآن کوئی آسان کام نہیں، یہ نہایت مشکل اور اہم ترین کام ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ قرآن آسمانی کلام ہے جو ذاتِ ربوبیتِ مآب سے نازل ہوا ہے۔ وہ ذات جس کی کنہ و حقیقت کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کلام اکمل الانبیاء کے قلب پر نازل ہوا، یہ کلام علومِ عالیہ، اور مطالب سامیہ پر مشتمل ہے جس تک پاکیزہ سیرت و خیالات اور عقلِ سلیم رکھنے والوں کی پہنچ ہو سکتی ہے۔

قرآن کے مطالب میں غور کرنے والا خدا کی عظمت سے دوچار ہوتا ہے جو اسے آہستہ اور سوچ سمجھ کر چلنے کی دعوت دیتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے یہ کہہ کر معاملہ آسان کر دیا کہ جس قدر تم سے ہو سکے قرآن میں غور و فکر اور عقل و فہم کو کام میں لاؤ۔ تفسیر سے ہمارا مقصد قرآن مجید کو اس نقطۂ نظر سے سمجھنا ہے کہ وہ ایک مکمل ضابطۂ دین ہے جو لوگوں کی ان امور کی طرف رہنمائی کرتا ہے جس میں ان کی دنیوی و اخروی سعادت پنہاں ہے۔ یہی اس کا بلند ترین مقصد ہے۔ باقی مباحث اس مقصد کے تابع اور فروع ہیں۔ (صفحہ ۱۷)

ہم قرآن مجید کو اسی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ وہ ایک دین ہے جو اللہ کی طرف سے اقوامِ عالم کے لئے ہدایت ہے اور انسانوں کی دنیا و آخرت کی سعادت کے لئے جو کچھ ضروری ہے اس پر حاوی و جامع ہے۔ (صفحہ ۱۸ و ۱۹)

قرآن فہمی کسی خاص دور یا کسی خاص شخص پر ختم نہیں ہوئی یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا

ہو سکتا ہے کہ آج ایک شخص کہے کہ ہمیں قرآن مجید کی تفسیر اور اس میں غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ سابق ائمہ نے کتاب و سنت پر غور کر لیا اور جو احکام اس سے مستنبط ہوتے تھے وہ نکال لئے، اب ہمارا کام صرف یہی ہے کہ ان پچھلے بزرگوں کے کاموں کو دیکھیں اور ان پر اکتفا کریں۔

اگر یہ خیال صحیح ہو تو پھر اب قرآن فہمی کی کوشش اور اس کی تفسیر کرنا فضول کام ہو گا جس میں تضیعِ وقت کے سوا کچھ بھی فائدہ نہیں۔ اس سے بزرگانِ سلف اور ان کے تفقہ کی عزت و عقیدت کا تو اظہار ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ خیال خام ہے جس کی تردید اجماعِ علماءِ امت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر آج تک کرتی چلی آئی ہے۔ میں حیران ہوں کہ ایک مسلمان کے دل میں اس قسم کا خیال

لہ یہ دونوں باتیں ایک ہی ہیں۔ رسول اللہ کا منشا قرآن کے مقصد کے خلاف ہو نہیں سکتا تھا۔ اس لئے جب منشائے خداوندی کو قرآن سے معلوم کر لیا جائے تو وہی منشائے رسول ہوگا۔ قرآن کا مفہوم عربی لغت اور تصریفِ آیات القرآنی سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

آ کیسے سکتا ہے۔

فقہ قرآنی اور احکام فقہی
وہ عملی احکام جنہیں اصطلاح میں فقہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، قرآن میں ان کا بہت کم بیان ہے۔ قرآن میں انسانی ذات کی نشوونما کا سامان ہے اور ارواح انسانی کو ان امور کی طرف دعوت دی گئی ہے جن میں ان کی بلندی وسعادت ہے، اور جن سے وہ جہالت کی پستیوں سے نکل کر علم کی بلندیوں پر فائز ہو جاتی ہیں۔ قرآن انسانوں کو اجتماعی زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتاتا ہے۔ اور یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے، اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والا بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہی چیزیں حقیقی فقہ کہلانے کی مستحق ہیں۔ اور یہ تعلیم اس درجہ مؤثر پیرایہ میں، سوائے قرآن مجید کے اور کسی جگہ سے نہیں مل سکتی۔ (صفحہ ۱۹)

قرآن تیرے حق میں یا تیرے خلاف حجت و دلیل ہے (حدیث)
ائمہ دین کا کہنا ہے کہ قرآن مجید تا قیامت ہر انسان کے لئے حجت و دلیل ہے، اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ "اَلْقُرْاٰنُ حُجَّۃٌ لَّکَ اَوْ عَلَیْکَ" (یعنی تیرے دعوے کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار قرآن ہے) اور اس کی یہ حیثیت قائم نہیں رہ سکتی جب تک ہر انسان اس میں اپنی عقل و فہم سے کام نہ لے اور اس کی حکمت و احکام کو صحیح طور پر معلوم نہ کر لے۔

یہی سبب ہے کہ قرآن کے مطالب و معانی اتنے گہرے ہیں کہ ان میں سے بیشتر تک ابھی عقل انسانی کی رسائی نہیں ہو سکی[1] اور کسی عالم یا امام نے انہیں کھول کر بیان نہیں کیا۔ (صفحہ ۲۰)

قرآن مجید میں ہر شخص کو اپنے طور پر غور و فکر کرنا ہے
(جیسا کہ کہا جا چکا ہے) قرآن مجید تمام نوع انسانی کے لئے ضابطہ ہدایت ہے۔ جو لوگ اس کے اولین مخاطب تھے وہ "پوری کی پوری نوع انسانی" نہیں تھے۔ نوع انسانی کا صرف ایک حصہ تھے۔ مثلاً فرمان خداوندی ہے "یَا اَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ" اے لوگو! اپنے رب کے قوانین کی مخالفت سے بچو" تو کیا یہ بات عقل میں آ سکتی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر غور نہ کریں بلکہ دوسرے غور و فکر کرنے والوں کی عقل و فکر پر بھروسہ کر کے بیٹھے رہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کسی آیت میں بھی ہمیں ان کی عقل و فکر پر بھروسہ کرنے کا حکم نہیں دیا۔ یاد رکھئے نوع انسانی میں سے ہر فرد کا یہ فریضہ ہے کہ وہ آیات قرآنی کو حسب استطاعت سمجھنے کی کوشش کرے۔ اس میں عالم اور جاہل کا بھی کوئی امتیاز نہیں۔ عام سمجھ بوجھ والے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ آیات سے ان کے ظاہری مطالب اخذ کرے۔ مثال کے طور پر سورۂ مومنین کی ابتدائی آیات کو لیجئے جن میں کہا گیا ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خَاشِعُوْنَ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ

---

[1] یعنی جوں جوں ان کا علم بلند ہوتا ہے قرآنی حقائق بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں اس لئے اس کے تمام حقائق کسی ایک دور میں منکشف نہیں ہو سکتے۔ (طلوع اسلام)

...... ہم ما تعلمون (۲۲)

ان سے ظاہر طور پر ایک عام سے عام آدمی بھی یہ معنی اخذ کر سکتا ہے۔ کہ ان آیات میں مذکورہ صفات کے حاملین کے لئے فوز و فلاح ہے اور وہ کامیاب زندگی گذاریں گے۔ اسے ان صفات میں سے خشوع کے معنی سمجھنے چاہئیں یا لغو سے اعراض کا مطلب معلوم کرنا چاہیئے۔ اور اس طرح بے فائدہ باتوں سے اعراض کر کے دنیوی اور دینی فوائد کے کاموں پر توجہ صرف کرنی چاہیئے۔ زکوٰۃ ادا کرنی چاہیئے۔ عہد و پیمان کی وفاداری پہ قائم رہنا چاہیئے۔ وعدہ پورا کرنا چاہیئے۔ فحش کے ارتکاب سے بچنا چاہیئے، اور یہ سمجھنا چاہیئے کہ جو ان احکام کی خلاف ورزی کرے گا وہ حدود اللہ سے تجاوز کرے گا اور اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔

ان مطالب کا سمجھ لینا ہر مومن پر خواہ وہ کسی طبقہ سے متعلق ہو مشکل نہیں، اسی طرح ہر ایک کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ قرآن مجید سے ان چیزوں کو سمجھ لے جو اس کے لیے خیر و سعادتمندی کا موجب ہیں اور ان چیزوں سے بچے جو شر و فساد کا باعث ہیں۔ یہ کلام اللہ تعالیٰ نے ہماری ہدایت کے لئے نازل فرمایا ہے اور وہ ہماری کوتاہیوں اور کمزوریوں سے خوب واقف ہے

حقائق قرآن کے سمجھنے کا جو درجہ اس سے اوپر ہے وہ فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

بلاشبہ تفسیر کے بہت سے مدارج و مراتب ہیں، اور اس کا سب سے آسان اور ابتدائی درجہ یہ ہے کہ وہ اجمالی طور پر قلب انسانی میں قوانین الٰہیہ کی عظمت اور پاکیزگی جاگزیں کر دے اور انسانی جذبات کو شر اور بدی سے ہٹا کر خیر پہ مائل کر دے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ اسے ہر انسان بآسانی قرآن سے حاصل کر سکتا ہے۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔ (صفحہ ۱۵ و صفحہ ۲۰ و صفحہ ۲۱)

اس کے بعد علامہ عبدہٗ نے قرآن فہمی کے اعلیٰ مراتب کے سلسلہ میں بعض امور گنائے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) اس سلسلہ میں پہلی چیز یہ ہے کہ قرآن میں استعمال ہونے والے مفرد الفاظ کے حقیقی معنی سمجھے یعنی یہ معلوم کرے کہ ان الفاظ کو اہل عرب کیونکر استعمال کرتے تھے اور اس سلسلہ میں کسی دوسرے کے قول اور فہم پر بھروسہ نہ کرے نہ اس پر اکتفا کرے، اس لئے کہ بہت سے الفاظ زمانہ نزول قرآن میں کسی خاص مطلب و معنی کو ادا کرنے کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ پھر بعد میں تھوڑے یا زیادہ عرصہ گذرنے پر، ان کے دوسرے معنی لئے جانے لگے۔ مثلاً لفظ "تاویل" ہے جو تفسیر کے معنوں میں مشہور ہو گیا۔ لیکن یہ لفظ قرآن میں دوسرے معنوں میں آیا ہے۔ یعنی انجام کار۔ عاقبت۔ قرآن کے وعدو عید کا نتیجہ ظاہر ہونا۔

اس ضمن میں قرآن پر غور و فکر کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ملت میں بعد میں پیدا ہونے والی اصطلاحات کی تحقیق کرے اور پھر ان میں اور قرآن میں آنے والے الفاظ میں فرق کرے۔ اکثر مفسرین قرآن کے الفاظ کا ترجمہ ان اصطلاحات کی رُو سے کرتے ہیں جو پہلی تین صدیوں میں ملت میں رائج ہو چکی تھیں۔ قرآن پر غور کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن کے الفاظ کے وہی معانی لے جو زمانہ نزول قرآن میں لئے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں بہتر طریقہ یہ ہے کہ الفاظ کے معانی کے تعین میں خود قرآن سے مدد لے اور مکرر آنے والے الفاظ کا قرآن میں مطالعہ کرے۔ بعض اوقات وہ دیکھے گا کہ ایک ہی لفظ متعدد معانی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً "ہدایت" وغیرہ۔ ان مختلف مقامات پر غور و فکر سے معلوم ہو جائے گا کہ فلاں مقام پر اس لفظ کے صحیح معنی کیا ہیں، اسی لئے کہا گیا ہے کہ "اَلْقُرْاٰنُ یُفَسِّرُ بَعْضُہٗ بِبَعْضٍ" (قرآن کا ایک مقام اپنے دوسرے مقام کی تفسیر کرتا ہے)۔ اسی طرح کسی لفظ کے کسی خاص معنی کو ترجیح دینے کے لئے قانون یہ ہوگا کہ وہ معنی سابقہ عبارت سے مطابقت و موافقت رکھتے ہوں، پورے موضوع و مطالب سے اتفاق رکھتے ہوں اور قرآن کے مجموعی مقصد سے ہم آہنگ ہوں۔

ص۔ رشید رضا نے قرآنی استعمال اور بعد میں ملت کے اصطلاحی استعمال کے سلسلہ میں "الولی" کے معنوں کی مثال دی ہے۔

پرویز صاحب نے جو لغت مرتب کیا ہے وہ انہی اصولوں پر مبنی ہے۔ اس لغت کی اشاعت سے، ایک طرف الفاظ قرآنی کے وہ معانی بھی واضح ہو جائیں گے جو غیر قرآنی تصورات و اصطلاحات کی رو سے متعین کر لئے گئے اور دوسری طرف ان الفاظ کا وہ مفہوم صاف طور پر سامنے آ جائے گا جو ان الفاظ کے اصلی مادوں اور قرآن کے مختلف مقامات میں ان کے استعمال سے متعین ہوتا ہے۔ اس لغت کا بنیادی نقشہ اور مقصود وہی بتایا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

لفظ ولیؔ کے معنی قرآن مجید میں بیشتر، ناصر و مددگار اور حمایتی اور دوست ہیں۔ اولیاء اللہ کے معنی ہیں وہ اہل ایمان و تقویٰ جو اللہ کے دین کے حامی و مددگار بنیں۔ لیکن بعد میں یہ اصطلاح چل پڑی کہ وہ لوگ، جو کرامات و خوارق کا مظاہرہ کریں اور ظاہری اسباب سے ماوراء قوانین کائنات میں تصرف کریں۔ انھیں اولیاء اللہ، کہا جاتا۔ حالانکہ صحابہ کرام اولیاء اللہ کے یہ معنی جانتے ہی نہیں تھے۔

(۲) دوسری چیز، عربی ادب و زبان کے اسالیب کا جاننا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ مسلسل مشق اور مزاولت کو ضروری بتاتے ہیں کیونکہ یہ ایک اکتسابی ملکہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ عرب اگر اس کی مزاولت چھوڑ دیں تب بھی یہ ان میں پیدائشی باقی رہے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ جب عربوں نے اس مشق کو چھوڑ دیا تو وہ عجم سے بھی پیچھے رہ گئے۔

(۳) تیسری چیز جسے وہ تفسیر قرآن کے لئے ضروری خیال کرتے ہیں تاریخ و احوال بشر سے واقفیت ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ میری سمجھ سے باہر ہے کہ ایک شخص جو احوال بشر اور اس کی ابتدائی تاریخ سے واقف نہ ہو وہ یہ نہ جانتا ہو کہ انسان شروع میں کیسے ایک ہوئے اور پھر کیسے بکھرے۔ اس کے لئے کیونکر ممکن ہے کہ وہ اس آیت کی شرح کر سکے "كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ (۲/۲۱۳) پھر یہ کہ ان کا وہ اتحاد جس پر وہ پہلے تھے مفید تھا یا مضر؟ اور یہ کہ پھر ان میں انبیاء کے بھیجے جانے سے کیا نتائج برآمد ہوئے۔

قرآن مجید نے اقوام عالم، قوانین الٰہی، آسمانوں اور زمین نیز انفس و آفاق میں آیات اللہ کا مجملاً ذکر کیا ہے۔ یہ اجمال اس ذات بلند و برتر کی طرف سے ہے جس نے ہر چیز کو اپنے احاطۂ علم میں لے رکھا ہے۔ پھر اس نے ہمیں غور و فکر اور زمین میں سیر و سفر کے ذریعہ اس اجمال کی تفصیل معلوم کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ ہم ترقی و کمال میں بڑھتے چلے جائیں۔ لیکن اگر ہم صرف اس کائنات کے ظاہر کو دیکھ لینے پر اکتفا کرلیں تو ہماری حالت اسی شخص کی ہوگی جو کتاب کے اندر تحریر کی ہوئی حکمت سے تو بے خبر ہے لیکن کتاب کے ظاہری رنگ اور جلد کے نقش و نگار کو دیکھتا رہے۔

(۴) گہری نظر سے قرآن کا مطالعہ کرنے والے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ان حالات کا بھی مطالعہ کرے جس میں اسلام آیا اور یہ معلوم کرے کہ قرآن مجید کی رُو سے انسان کی ہدایت کا کیا مفہوم ہے۔ اسے ضلالت کی صحیح تعریف معلوم کرنے کے لئے اس زمانہ کا حال معلوم کرنا پڑے گا جس میں قرآن نازل ہوا۔ ایسے غور و فکر کرنے والوں کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ سنی سنائی کہہ دیں کہ جب قرآن مجید آیا تھا تو لوگ ضلالت و گمراہی میں مبتلا تھے اور قرآن نے ان کے اباطیل کی تردید کی، بلکہ انھیں اس دور کی غلط رسوم اور عادات کا کھوج لگانا چاہیئے جن کی تردید کے لئے آیات نازل ہوئیں۔

(۵) ایک مفکر مفسر کے لئے آنحضرتؐ کی سیرت اور آپ کے صحابہؓ کے حالات، ان کے علم و عمل کی کیفیات، اور ان کے دنیوی و اخروی معاملات میں تصرفات کا علم بھی ضروری ہے (صفحہ ۲ تا صفحہ ۲۰)

الغرض ہماری نظر میں تفسیر قرآن کی دو شکلیں ہیں۔

(۱) ایک تو وہ خشک قسم کی تفسیر جو اللہ سے بیگانہ اور قرآن سے دور کرتی ہے۔ جس میں حل الفاظ، جملوں کے اعراب،

اور اس کی صیاغتوں کا بیان اور فنی نکات کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی کوششوں کو تفسیر نہیں کہنا چاہیئے، ان کی حیثیت تو ایک طرح فنی مشقوں کی ہے جن میں نحوی معانی و بیان وغیرہ کی مشقیں حل کرائی جاتی ہیں۔

(۲) دوسری قسم کی تفسیر وہ ہے جس سے روح کی بیداری، عمل خیر میں سبقت، اور قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کا جذبہ کارفرما ہو، بات کو سمجھ کر قوانین و احکام کی حکمت سے واقف ہونا مراد ہو۔ یہ تفسیر کا صحیح موضوع ہے۔ (صفحہ ۲۴ و صفحہ ۲۵)

کیا تفسیر کا مطلب یہ ہے

ہمارے آج کے زمانہ میں اور آج سے صدیوں پہلے لوگوں کی نظروں میں تفسیر کے معنی یہ تھے اور ہیں کہ بعض علماء نے جو کچھ تفسیر کی کتابوں میں لکھا ہے وہ معلوم کر لیا جائے، باوجودیکہ ان کی شرحوں اور تفسیروں میں باہمدگر اختلاف و تناقض ہے جس سے کلام اللہ منزہ و پاک ہے۔ بلکہ وہ اعلان کر رہا ہے وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ۔ (اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات ہوتے)

کیا اچھا ہوتا کہ یہ لوگ مختلف تفسیروں میں سے قرآن مجید کے وہ صحیح معنی نکال لاتے جن پر ان کے دل و دماغ مطمئن ہوتے۔ پھر ان مطالب کو لوگوں میں عام کرتے، لیکن انھوں نے تو اسے فخر و مباہات کے لئے ایک فن بنا رکھا ہے جس میں تفنن طبع اور مقابلہ کیا جاتا ہے اور خوب دل کھول کر باتیں بنائی جاتی ہیں۔ طبع آزمائیاں ہوتی ہیں۔ نئی نئی تاویلات کی جاتی ہیں۔ قرآن کے مقاصد سے الگ ہٹ کر دور دراز کی کوڑیاں لائی جاتی ہیں۔

یاد رکھیئے۔ اللہ تعالیٰ روز قیامت ہم سے یہ نہیں پوچھے گا کہ فلاں آیت کے بارے میں لوگوں کے کیا اقوال تھے اور وہ کیا سمجھے تھے۔ بلکہ وہ صرف اپنی کتاب کے متعلق پوچھے گا جو ہماری ہدایت و رہنمائی کے لئے نازل کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ یہ پوچھے گا کہ کیا تم تک ہمارا پیغام پہنچا تھا؟ پھر کیا تم نے اس پیغام میں غور و تدبر کیا تھا۔ کیا جن چیزوں کے کرنے کا تمھیں حکم دیا گیا تھا اور جن چیزوں سے تمھیں منع کیا گیا تھا تم نے انھیں سمجھ لیا تھا؟ کیا تم نے قرآن کی تعلیم کے مطابق عمل کیا تھا اور رسول کے طریقہ پر کاربند رہے تھے؟ حیرت ہے کہ ہم یہ جانتے ہوئے بھی غافل بیٹھے ہیں۔

عربی زبان کی اہمیت

مقدمہ تفسیر کے آخر میں علامہ نے قرآن فہمی کے سلسلہ میں عربی زبان کی اہمیت و ضرورت پر زور دیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ کے دین حق پر قرآن ہی حجت بالغہ ہے۔ ہمارا اسلام کی بقا اور کی اس کے سوا کوئی شکل نہیں کہ قرآن کو صحیح طور پر سمجھا جائے اور اس کے فہم کے لئے عربی زبان کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بار بار قرآن مجید میں غور و فکر اور تدبر کا حکم دیا ہے۔ قرآن سے رہنمائی اور عبرت و نصیحت حاصل کرنے کی تاکید کی ہے۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ نماز میں جو کچھ ہم کہتے ہیں اسے جانیں، ان تمام احکام پر عمل درآمد عربی زبان جانے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اور یہ کلیہ ہے کہ جس چیز کے بغیر کسی فریضہ کی تکمیل نہ ہو سکے وہ چیز بھی فرض ہو جاتی ہے...... لہٰذا عربی زبان کا سیکھنا دین اسلام کی ضروریات میں سے ہے، اور جب ہم مسلمانوں کو قرآن مجید کی طرف دعوت دیتے ہیں تو اس میں عربی زبان از خود شامل ہوتی ہے (صفحہ ۳۱)

صدر اول میں مسلمان اہل علم نے قرآن مجید کی جاذبیت کا اندازہ کر لیا تھا اور ان پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی تھی کہ اسلام کی

عربی زبان میں قرآن مجید جو جامعیت، جاذبیت اور اعجاز و کمال رکھتا ہے وہ دنیا کی کسی زبان کے ترجمہ میں پیدا نہیں ہو سکتی

حفاظت کا دار و مدار قرآن کی حفاظت پر ہے۔ جب عجمی اقوام نے اسلام کو اپنایا اور انھوں نے قرآن کی لذت محسوس کی تو انھوں نے بھی بالاتفاق قرآن مجید کو عربی زبان میں رکھنے کا فیصلہ کیا[1]۔ اور اس کے سمجھنے کے لئے عربی زبان کی حفاظت کو ضروری قرار دیا۔ اور اس ضمن میں انھوں نے قواعد و ضوابط مرتب کئے۔ بلاشبہ ہر زبان اپنی جگہ ایک حیثیت رکھتی ہے اور کوئی قوم اپنی زبان کے بغیر زندہ نہیں رہتی۔ لیکن امت کے اسلاف نے عربی زبان کی جو خدمت کی تھی وہ قومی نقطۂ نظر سے نہ تھی کیونکہ اسلام تو عربی و عجمی کے امتیازات ختم کرنے کے لئے آیا تھا۔ لہٰذا اسلاف امت نے عربی زبان کی جو خدمت کی وہ دین اور قرآن کی حفاظت کے لئے تھی نہ کہ قومیت عربی کی خاطر۔ اسلام میں جو بھی داخل ہوتا تھا وہ اپنے آپ کو تمام مسلمانوں کا بھائی خیال کرتا تھا خواہ وہ مسلمان عربی ہو یا ایرانی حبشی ہو یا ترکی۔

لیکن افسوس کہ بعد میں مسلمانوں میں بھی قومیت کے جاہلی تعصبات رونما ہونے لگے جن سے اسلام نے شدت سے منع کیا تھا، اور اس کا سبب بھی در اصل عربی زبان کی کمزوری کے باعث ان کے دین و علم کی کمزوری تھا۔ حتیٰ کہ آخر میں بعض غیر عربی اقوام نے اپنی اپنی قوموں کو قرآن مجید کے ترجموں کی طرف دعوت دینی شروع کر دی۔ اور عربی قرآن سے بے نیاز کر دیا۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام تو ایک کا دین ہے اور اس کی اپنی کوئی زبان نہیں[2]۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انھوں نے دین کی وحدت کو منتشر کر دیا اور اپنے دین و علم میں کمزور ہو گئے۔۔۔ پھر قومیت اور وطنیت ان پر اس قدر غالب ہو گئی کہ وہ تعصب کی وجہ سے اس فرعون کے بھی مداح بن گئے، جسے کتاب اللہ کی تعلیم ملعون بتاتی ہے[3]۔ (صفحہ ۱۳۰ و ۱۳۱)

مسلمانوں نے قرآن چھوڑ کر اپنی عزت و قوت ختم کر دی

مسلمانوں نے اپنی عظیم مملکت اور بے نظیر قوت قرآن چھوڑ کر ختم کر لی۔ ان کی کمزوریوں کا باعث قرآن مجید سے اعراض ہے، اور ان کی گذشتہ سرفرازی و سروری اور مملکت و قوت کی واپسی کی صرف ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے معاملاتِ زندگی کے لئے قرآن مجید سے رہنمائی طلب کرنے لگیں اور حبل اللہ یعنی قرآن مجید کو مضبوط تھام لیں۔

---

[1] قطع نظر ان کے فیصلے کے۔ قرآن وہی قرآن ہے جو اپنی اصلی (عربی) زبان میں ہے۔ کسی دوسری زبان میں "قرآن" ۔ قرآن کا ترجمہ ہوگا۔ قرآن نہیں کہلا سکے گا۔ (طلوع اسلام)

[2] اسلام وہ طریق ہے جس کے مطابق قرآن پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس لئے اسلام کی کوئی زبان نہیں ہو سکتی۔ قرآن عربی زبان میں ہے اور اسے عربی زبان میں رہنا چاہیئے۔ لیکن اسلام کے وہ لوگ بھی پابند ہو سکتے ہیں جن کی زبان عربی نہ ہو۔ (طلوع اسلام)

[3] عربی ممالک میں۔ قومیت اور وطنیت کا یہ غیر قرآنی جذبہ آج پہلے سے بھی زیادہ شدت اختیار کر گیا ہے۔

(طلوع اسلام)

سورۂ فاتحہ (۲)

قرآن مجید کی سب سے پہلی نازل ہونے والی سورت "الفاتحہ" ہے اور اس کا ثبوت کائنات میں سنۃ اللہ کا عام نظام ہے خواہ وہ عالم تشریعی ہو یا عالم ایجاد۔ اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ایک چیز کو مجملاً ظاہر کیا جاتا ہے اور پھر بتدریج اس کی تفصیل بتائی جاتی ہے۔ تعلیمات الٰہیہ کی مثال بالکل بیج اور تنا اور درخت کی سی ہے، یہ تنا اور درخت ابتدائً "مادہ حیات" کی شکل میں اپنی تمام قوتوں پر حاوی ہوتا ہے۔ پھر وہ بتدریج بڑھتا ہے، اس کی شاخیں پھیلتی ہیں۔ اور پھر وہ اپنے پھل دیتا ہے۔ اسی طرح سورۂ فاتحہ قرآن مجید کی تعلیمات پر مجملاً حاوی ہے اور قرآن مجید میں اسی کے مجمل موضوعات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ میں اپنے اس بیان سے ان لوگوں کے بیان کی تائید نہیں کرنا چاہتا جو کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے اسرار سورۂ فاتحہ میں ہیں اور سورۂ فاتحہ کے اسرار بسم اللہ کی ب میں۔ اور ب کے اسرار اس کے نقطہ میں ہیں۔ یہ فی نفسہ غیر معقول بات ہے جو مبالغہ آمیزی کی پیداوار ہے۔ اس طرح تو قرآن کی مخصوص صفت "بیان" کا انکار ہو جاتا ہے۔

میرا مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید جن بنیادی تعلیمات کو پیش کرتا ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) توحید۔ اس لئے کہ لوگ مدعی توحید تھے لیکن وہ بایں ہمہ بت پرست اور غیر اللہ کی عبادت سے ملوث تھے۔

(۲) تبشیر و انذار۔ یعنی قانون خداوندی کی پابندی کرنے والوں کے لئے نیک انجام کی خوشخبری اور مخالفت کرنے والوں کے لئے بد انجام سے ڈراوا، یہ خوش خبری افراد و اقوام کے لئے عام تھی اور دنیوی و اخروی نعمتوں اور سعادت پر مشتمل تھی۔ جس طرح انذار بھی دنیوی و اخروی سعادت پر مشتمل تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مومنین سے استخلاف فی الارض، دنیوی عزت، بلندی، اقتدار و سروری کا وعدہ فرمایا۔ اور مخالفین سے دنیوی رسوائی اور بدبختی کا اسی طرح وعدہ فرمایا جس طرح مومنین سے آخرت میں جنت کا اور مخالفین سے جہنم کی آگ کا۔ وعدہ فرمایا۔

(۳) عبادت۔ جس سے دلوں میں توحید زندہ ہو کر جاگزیں ہو جائے۔

(۴) سعادت دنیوی اور اخروی اور اس کی راہ پر چلنے کا بیان۔

(۵) نیکوکار اور بدکاروں کے حالات۔ وہ لوگ جنھوں نے حدود اللہ کی پابندی میں زندگی گذاری اور وہ لوگ جنھوں نے احکام خداوندی کو پس پشت ڈالا۔ ان کے حالات اس لئے بیان فرمائے تاکہ ان سے عبرت حاصل ہو اور نیکوکاروں کے طریقہ کو پسند کرنے کی ترغیب ہو۔ اور نوع انسانی کو اللہ کے قوانین اور ان کے انجام و عواقب کا علم ہو سکے۔

یہی وہ اہم اور بنیادی موضوع ہیں جن پر نوع انسانی کی سعادت دنیوی و اخروی کا دارومدار ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ ان تمام امور پر مجملاً روشنی ڈالتی ہے (صفحہ ۳۰)

اس کے بعد علامہ نے ان امور کی تفصیل بتاتے ہوئے عبادت پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ توحید کے بعد کمال عبادت یہ ہے کہ

رُوحِ عبادت کا مفہوم

انسان باہم گرحق اور استقامت کی تعلیم عام کریں، ایک دوسرے کو حق اور استقامت پر قائم رہنے کی تاکید کریں۔ سورۂ فاتحہ میں غور کرنے والے کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سورت دلوں میں روحِ عبادت کو کس طرح بٹھا دیتی ہے۔ روحِ عبادت سے مراد اللہ کی قوت و طاقت اور اس کے قانون کی عظمت کو دل میں جاگزیں کر دینا ہے۔ سورۂ فاتحہ میں صلوٰۃ و صیام اور ان سے متعلق احکامات سے قبل عبادت کا تذکرہ ہے اور یہی عبادت وہ روح ہے جو انسان کو بدنی اعمال کرنے پر مائل کرتی ہے۔ دراصل عبادت وہ پہلی چیز ہے جس کے متعلق نماز روزے سے پہلے قرآن میں تعلیم دی گئی ہے، اعمال و حرکات تو حقیقتِ عبادت تک پہنچنے کے وسائل و ذرائع ہیں۔ درحقیقت عبادت کا گودا فکر و عبرت ہے۔ (ص ۳۰۷، ۳۰۸)

کلامِ پاک میں دو لفظ بلا کسی معنوی اضافے کے محض تاکید کیلئے نہیں آتے

یہ کسی مسلمان کو دل میں ایسا خیال کرنے یا زبان سے یہ کہنے کی اجازت نہیں دے سکتا کہ قرآن میں کوئی دو الفاظ جو شکل و وزن میں باہم گر مشابہ ہوں، محض تاکید لفظی کے لئے آگئے ہیں اور ان سے کوئی معنوی افادہ مطلوب نہیں۔ قرآن مجید میں دو لفظ آنے کے معنی یہ ہیں کہ ایک لفظ دوسرے لفظ کے معنے پر کچھ اضافہ یا مزید وضاحت کر رہا ہے یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ بغیر معنوی فائدہ کے اضافہ کے ایک لفظ کے ساتھ دوسرا لفظ صرف تاکید کے لئے جوڑ دیا جائے۔ جسے ہم مترادف کہتے ہیں اس قسم کے مترادف الفاظ تو ان لوگوں کی تحریر میں پائے جاتے ہیں جو محض عبارت کی ظاہری خوبی مدنظر رکھتے ہیں اور جن کا شعار عبارت آرائی ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں تھوڑے سے فرق سے الفاظ آتے ہیں یا آیات کا تکرار ہے، وہ معنوی اضافہ ہے اور اپنی جگہ پر قابلِ غور۔ (ص ۳۰۹)

ریاء کی دو قسمیں

ایک ریا تو نفاق کی وجہ سے ہوتا ہے جس میں انسان لوگوں کو دکھانے کے لئے کام کرتا ہے۔ ریا کی دوسری قسم وہ ہے جس میں عادت کی وجہ سے کوئی کام کیا جائے اور یہ نہ دیکھا جائے کہ کام کے کرنے میں کیا مقصد اور کیا فائدہ اور مصلحت ہے۔ ریا کی یہ قسم لوگوں میں عام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے ایک شخص کی نماز عقل و شعور آجانے کے بعد بھی بالکل اسی طرح نقلی ہوتی ہے جس طرح وہ عہدِ طفولیت میں لوگوں کو پڑھتے دیکھ کر ان کی نقل کرتا تھا۔ وہ یہ نمازیں عادتاً پڑھتا ہے اور اس سلسلہ میں عقل و فکر سے کوئی کام نہیں لیتا۔ اس قسم کی نمازوں میں اللہ کے لئے کچھ نہیں ہوتا۔ وَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۔۔ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ میں یہ دونوں قسم کی ریائیں شامل ہیں۔

استعانت

استعانت کے معنی ہیں امداد طلب کرنا۔ یعنی کام کے پورا کرنے میں اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو کم پاتے ہوئے اس کی کو پورا کرنے کا مطالبہ کرنا۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ہوتا ہے جبکہ مدد مانگنے والا انسان خود تنہا اس کام کو کرنے سے عاجز ہوتا ہے۔

إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ کا یہ چھوٹا سا جملہ ہماری توجہ دو اہم اور گرانقدر اصولوں کی طرف مبذول کرا رہا ہے جو دنیا و آخرت میں

معراج سعادت ہیں۔

پہلا اصول یہ ہے کہ ہم اپنی امکانی قوتوں سے مفید کام کرنے اور انہیں استوار کرنے کی پوری پوری کوشش صرف کریں۔ کیونکہ مدد مانگنے کا سوال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک آدمی کسی کام کے لئے اپنی تمام کوششیں صرف کرے لیکن پھر بھی اس میں کامیابی نہ ہوسکے یا اسے ناکامی کا اندیشہ ہو جائے مثلاً اگر کسی کا قلم میز سے گر جائے تو اسے قلم اٹھانے کے لئے کسی دوسرے کی مدد کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن اگر قلم کسی ایسی چیز کے نیچے گر جائے جسے وہ تنہا اٹھا نہ سکے تو اسے اس سلسلہ میں دوسرے کی مدد کی ضرورت پڑے گی اور وہ بھی اس وقت جب وہ اپنی تمام کوششیں اس کے حاصل کرنے میں صرف کر چکا ہو، مدد مانگنے کا یہ جذبہ دنیوی سعادت کی ترقی کا موجب اور آخروی سعادت کا ایک ذریعہ ہے۔

دوسرا اصول جس کی طرف یہ آیت متوجہ کر رہی ہے وہ حصر ہے۔ یعنی صرف خدا سے استعانت کرنی چاہیئے۔ اور یہی روح دین اور توحید خالص کا کمال ہے، جس سے خدا کا ماننے والا تمام غیر اللہ کی غلامیوں سے آزاد ہو جاتا ہے، اور تمام روحانی پیشواؤں سے اپنی ارادت منقطع کر لیتا ہے نیز مردہ و زندہ تمام چھوٹے اقتداروں سے اپنے عزائم کو آزاد کر لیتا ہے۔ اس طرح مرد مومن پوری یکسوئی سے صرف خدا کی طرف متوجہ ہو کر انسانوں کا آزاد و شریف ساتھی اور اللہ کا تابعدار بندہ بن جاتا ہے۔ (صفحہ ۵۹...)

پھر لفظ استعانت میں یہ احساس بھی پایا جاتا ہے کہ بندہ اللہ تعالےٰ سے کسی ایسی چیز کے سلسلہ میں مدد کا طالب ہے جس میں خود بندہ کی اپنی صلاحیتوں اور محنتوں کا دخل ہے اور اس مدد کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے مقصد کی تکمیل میں اس کی مدد کرے۔ نیز اس میں انسانی تکریم و احترام بھی شامل ہے کیونکہ اس میں اس کے عمل کو اصل بتایا گیا ہے اور اسے سمجھایا گیا ہے کہ کوشش اور محنت کو ترک کرنا قانون خداوندی کا دستور نہیں، لہذا جو جدوجہد اور کوشش چھوڑے گا وہ مذموم ٹھہرے گا۔ نہ کہ محمود۔ دوسری طرف یہی لفظ یہ بھی بتا رہا ہے کہ انسان کو خود اپنی طاقتوں پر مغرور نہیں ہونا چاہیئے نہ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اسے اپنی قوتوں اور طاقتوں کے بعد اللہ تعالیٰ کی عنایت کی ضرورت باقی نہیں رہی، کیونکہ یہ تصور انسانی ہلاکت کے مترادف ہے۔

[طلوع اسلام۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اللہ کی مدد۔ یا اس کی عنایت وغیرہ "مجرد اصطلاحات" (Abstract Terms) ہیں جن کا محسوس مفہوم ذہن میں نہیں آتا۔ یہ اگر اسی طرح رہیں تو ان سے وہ تمام خطرات پیدا ہو جائیں گے جو روحانی پیشواؤں وغیرہ سے استمداد کے سلسلہ میں اوپر گنائے گئے ہیں۔ ان خطرات سے محفوظ رہنے کی ایک ہی شکل ہے۔ اور وہ یہ کہ "مدد مانگنے" اور "مدد ملنے" کی محسوس صورت سامنے آ جائے۔ "خدا سے مدد مانگنے" کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی کوششوں کو اس کے مقرر کردہ قوانین سے ہم آہنگ رکھے۔ اس طرح خدا کے قوانین ان کوششوں کو نتیجہ خیز اور بار آور کر دیں گے۔ "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْن" سے مراد یہ ہے کہ ہم صرف قوانین خداوندی کی (جو باہر کی دنیا میں کتاب فطرت میں۔ اور انسانوں کی دنیا کے لئے قرآن میں دیئے گئے ہیں) اطاعت کرتے ہیں اور انہی قوانین سے اپنی امیدیں وابستہ رکھتے ہیں کہ وہ ہماری کوششوں کو نتیجہ خیز بنا دیں گے۔ اس طرح استعانت کے بعد کسی غیر خداوندی قوت سے مدد مانگنے

یا مدد ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔]

صراط مستقیم

مفسرین نے صراط مستقیم کے معنی دین، حق، عدل یا حدود اللہ بتائے ہیں لیکن ہم کہتے ہیں کہ یہ لفظ ان تمام امور پر حاوی ہے جن سے انسان دنیوی و اخروی سعادت سے ہمکنار ہوں اور اس میں عقائد، آداب و احکام اور جملہ تعلیمات بھی شامل ہیں۔

ضلالت وہدایت کا معیار قرآن مجید ہے

ہمارے سامنے ہدایت و ضلالت کا معیار قرآن مجید ہے اگر ہمیں اپنی ہدایت و ضلالت کا اندازہ لگانا ہو تو اس کے لئے ہمیں یہ کرنا چاہیئے کہ اپنے دماغ میں جو اعتقادات ہوں انھیں قرآن مجید کی کسوٹی پر پرکھیں اور ایسا کرتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس بات کا التزام رکھیں کہ اپنے دماغ کے کسی عقیدہ کو قرآن پر اثر انداز نہ ہونے دیں ورنہ اس طرح ترازو، باٹ اور جس چیز کو تولا جا رہا ہے سب خلط ملط ہو جائیں گے اور ہم فیصلہ نہیں کر سکیں گے کہ ہدایت کیا ہے اور ضلالت کیا۔ میرا مطلب یہ ہے قرآن کو تمام مذاہب، آراء و افکار، عقائد و خیالات، کے بارے میں اصل ماننا چاہیئے۔ نہ یہ کہ ہم مذاہب و عقائد کو اصل مان کر پھر ان پر قرآن مجید کو پرکھیں اور پھر قرآن میں تاویل و تحریف کریں جیسا کہ عنادپسند اور بے توفیق لوگوں کا شیوہ ہوتا جا رہا ہے۔ (صفحہ ۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے متعلق دلچسپ بحث

عموماً محدثین حضرات بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو سورۂ فاتحہ کا جزو قرار نہیں دیتے اور اس ضمن میں متعدد احادیث پیش کرتے ہیں تفسیر المنار نے بھی اس سلسلہ میں دونوں قسم کی احادیث پیش کی ہیں۔ یعنی وہ احادیث جن میں یہ بتایا جاتا ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا شمار سورۂ فاتحہ کا جزو ہے، اس موضوع پر خاصی تفصیلی بحث کرنے کے بعد علامہ عبدہ جس انداز سے اس کا فیصلہ کرتے ہیں وہ ان کی قرآنی بصیرت کی شہادت ہے۔

دونوں قسم کی احادیث بیان کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں۔

حدیث کی دلالت ظنی اور سلبی اور کلام پاک کے اندر سورۂ فاتحہ میں بسم اللہ کا اندراج ایجابی اور قطعی۔ پھر جب حدیث کی صحت

میں مخالف فن حدیث کے اصولوں کے تحت کلام کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً ایک راوی کا اپنے سے زیادہ ثقات کی مخالفت کرنا۔ تو قرآن میں جو چیز قطعی اور تواتر کے ساتھ درج ہے وہ حدیث کی صحت کو سلب کرنے کی سب سے زیادہ مستحق ہے۔ (صفحہ)

علامہ اسلم جیراجپوری کی شہرہ آفاق کتاب

تاریخ الامت

جلد اوّل ۲/-

جلد دوم ۲/۸/-

جلد سوم ۲/-

جلد چہارم ۲/۸

جلد پنجم ۳/-

جلد ششم ۲/۸

جلد ہفتم ۲/-

جلد ہشتم ۲/۸/-

تاریخ الامت مکمل سیٹ آٹھ جلدوں کی قیمت اُنیس روپے آٹھ آنے

(علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ کالونی — لاہور

اسلام کی سرگذشت

(ڈاکٹر احمد امین مصری مرحوم)

باب ششم

دینی حرکت کا تفصیلی بیان

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اعتبار اسلام میں تمام حرکتوں سے زیادہ دینی حرکت کو فروغ اور مقبولیت حاصل رہی۔ اور اس کا میدان زیادہ وسیع تھا اکثر علماء جو ان دور میں پیدا ہوئے علمائے دین ہی تھے، اس کا سبب یہ تھا کہ لوگوں کے اذہان پر دین ہی کا تسلط تھا اور اسی میں وہ اپنی وحدت اور غلبہ کا راز مضمر سمجھتے تھے۔ اگر دین نہ ہوتا تو عرب کے لوگ مختلف شہروں میں بٹے ہوئے ہوتے جو ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ رہے ہوتے۔ اگر دین نہ ہوتا تو وہ اپنا گھر برباد کرنے میں لگے رہتے اور کبھی اپنے علاقہ و ملک سے باہر نہ نکل سکتے۔ وہ کبھی مختلف شہروں اور مختلف ممالک کو نہ فتح کر سکتے اور نہ ان پر اپنا اقتدار قائم کر سکتے۔ لہٰذا دین ہی دنیا میں بھی ان کی عزت کا موجب تھا اور آخرت میں بھی دین ہی ان کی امید گاہ تھا۔ عربوں کے علاوہ دوسری قومیں بھی مخلصانہ طور پر اسلام میں داخل ہوئیں اور اس پر ایمان لائیں کہ ان کی سعادت و فلاح کا یہی ایک راستہ ہے اس کے بعد دونوں مل کر قرآن پر متوجہ ہوئے تاکہ اسے سمجھیں حدیث پر متوجہ ہوئے تاکہ اسے جمع کریں اور اس کی شرح کر سکیں اور دونوں نے انھوں نے ان حوادث و وقائع سے متعلق احکام و قوانین کا استنباط شروع کر دیا جو اس نئی مملکت کو جس کی حدود دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں نت نئے انداز سے پیش آ رہے تھے رہ گئے دنیوی اور فلسفی علوم تو ان کی حالت بڑی کمزور تھی بلکہ ان کے کچھ شعبے اگر ترقی پاتے بھی تھے تو اس لئے کہ دین کی ترقی میں اس کی ضرورت پڑتی تھی۔ یا وہ خود دین کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے تھے۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز طب کی ایک کتاب کو جو انہیں مل گئی تھی شائع کرنے کے لئے کئی دن تک خدا سے استخارہ کرتے رہے۔ دوسری طرف حالت یہ تھی کہ فتن۔ ملاحم۔ غزوات اور فتوحات کے

متعلق خبریں جب احادیث کی شکلیں اختیار کرتی تھیں تب کہیں مقبول ہوتی تھیں۔ اس سے پہلے ہم اس دینی حرکت کا بیان اجمالی طور پر کر چکے ہیں۔ اب اسی کو ہم کسی قدر تفصیل سے بیان کریں گے۔ یہ علمی حرکت جن محوروں پر گھوم رہی تھی ان میں سے اہم ترین تین محور تھے۔ قرآن اور اس کی تفسیر۔ حدیث، اس کی جمع اور تبویب۔ نو پیش آمدہ حوادث کے لئے احکام کا استنباط۔ یہی وہ چیز ہے جسے ہم تشریع کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

فصل اوّل

(قرآن اور اس کی تفسیر)

قرآن کریم رسول اللہ صلعم پر تقریباً بیس سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوتا رہا۔ یہ وقتاً فوقتاً حوادث اور حالات کے مطابق نازل ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلعم وفات پا گئے اور آپ نے قرآن کو کسی ایک مصحف میں جمع نہیں فرمایا تھا[لہ]۔ بلکہ وہ منتشر صحیفوں میں لکھا ہوا تھا جو کاتبین وحی نے لکھے تھے یا حفاظ صحابہ کے سینوں میں موجود تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں انھوں نے قرآن کو جمع کرنے کا حکم دیا لیکن وہ بھی کسی ایک مصحف میں نہیں بلکہ مختلف صحیفوں کو جمع کر دیا گیا تھا جن میں قرآن کی آیات اور سورتیں لکھی ہوئی تھیں۔ نیز وہ آیات بھی لکھ لی گئی تھیں جو صرف لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھیں۔ اور یہ تمام صحیفے جن میں قرآن لکھا ہوا تھا حضرت ابوبکرؓ کے پاس رہے۔ اس جمع و تدوین کے کام کی ذمہ داری حضرت زید بن ثابتؓ کے سپرد کی گئی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے منتقل ہو کر یہ صحیفے حضرت عمرؓ کے پاس آئے۔ پھر حضرت حفصہ بنت عمرؓ کے پاس۔ حتیٰ کہ جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے حضرت حفصہؓ سے یہ صحیفے لے کر صحابہؓ کی ایک جماعت کو جن میں حضرت زید بن ثابتؓ۔ عبداللہ ابن الزبیرؓ سعید بن العاصؓ بھی تھے اس کام پر مقرر فرمایا کہ وہ ایک مصحف میں قرآن کو جمع کریں اور پھر اسی مصحف سے بہت سی نقلیں تیار کی گئیں جو مختلف شہروں میں تقسیم کر دی گئیں اور جو مصاحف اس مصحف کے خلاف پائے گئے ان کو جلا دیا گیا۔ یہ بہت طویل داستان ہے جس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں ہے۔

قرآن عربی زبان میں عربوں کے اسلوب کلام کے مطابق نازل ہوا تھا۔ اس کے تمام الفاظ عربی ہیں باستثنا ان قلیل التعداد الفاظ کے جو غیر عربی یعنی دوسری زبانوں سے لئے گئے تھے لیکن عربوں نے انھیں اپنا لیا تھا اور ان پر اپنے قواعد جاری کر دیئے تھے۔ قرآن کا اسلوب

[لہ] یہ بات واقعات و حقائق کے خلاف ہے۔ طلوع اسلام میں اس موضوع پر تفصیل سے کہا جا چکا ہے۔ لہٰذا اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ تاہم یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ رسول اللہ صلعم کی حیات ہی میں قرآن کریم مصحف کی شکل میں جمع ہو چکا تھا۔ یعنی نبی اکرمؐ قرآن کریم کو اسی شکل و ترتیب میں جس میں وہ اب ہمارے پاس ہے امت کو دے کر گئے تھے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ (طلوع اسلام)

بیان خاص عربی اسلوب ہے۔ اس میں حقیقت و مجاز اور کنایہ وغیرہ سب ہی موجود ہیں اور یہ سب چیزیں اسی طریقے سے استعمال ہوئی ہیں جس طرح عرب انہیں استعمال کرتے تھے۔ یہ بات بالکل فطری ہے۔ کیونکہ قرآن اولاً ــــ عربوں ہی کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے آیا تھا۔ لہٰذا ضروری تھا کہ وہ ایسی زبان میں ہوتا جسے عرب کے لوگ سمجھ سکتے (وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (اور ہم نے تمام رسولوں کو ان کی قوم کی زبان ہی میں بھیجا تھا تاکہ وہ ان کے سامنے وضاحت کے ساتھ خدائی احکام کو پیش کر سکیں)۔

پورا قرآن ہر صحابی کی ذہنی اور عقلی گرفت میں نہیں آسکتا تھا

اس کے باوجود (یہ حقیقت ہے کہ) سارا قرآن تمام صحابہ کی ذہنی اور عقلی گرفت سے باہر تھا یعنی سب میں یہ اہلیت نہیں تھی کہ وہ سارے قرآن کو ــــ اجمالاً اور تفصیلاً ــــ ایک مرتبہ سن لینے کے بعد فوراً سمجھ سکیں۔ ابن خلدون کا یہ قول صحیح نہیں ہے کہ "قرآن عربوں کی زبان میں، ان کی بلاغت کے اسلوبوں کے مطابق نازل ہوا تھا اور وہ سب کے سب اسے سمجھتے اور اس کے مفردات اور ترکیبات میں اس کے معانی و مطالب کو جانتے تھے۔"[1] کیونکہ عربی زبان میں قرآن کا نازل ہونا اس امر کا متقاضی نہیں ہے کہ عرب کے تمام آدمی قرآن کو اس کے مفردات اور ترکیبات کے ساتھ سمجھ سکتے ہوں۔ اس کی دلیل ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ہر کتاب جو کسی زبان میں لکھی گئی ہو ضروری نہیں کہ اس زبان والے سب کے سب اسے سمجھ سکیں۔ کتنی انگریزی اور فرانسیسی کتابیں ہیں جنہیں انگریز اور فرانسیسی بھی خود نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ کسی کتاب کا سمجھنا صرف اس زبان کے جاننے پر موقوف نہیں ہوتا جس میں وہ کتاب لکھی گئی ہے بلکہ اس کے لئے ایک خاص عقلی درجہ کی ضرورت ہوتی ہے کہ پڑھنے والوں کی عقل کا درجہ اور اس کتاب کا درجہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو۔ قرآن کے سامنے یہی حالت عربوں کی تھی وہ سب کے سب قرآن کو اجمالی اور تفصیلی طور پر سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ اپنے عقلی درجے کے مطابق قرآن کو سمجھنے کے سلسلہ میں مختلف مدارج پر تھے۔ قرآن کے تمام الفاظ کے معانی بھی عرب کے سارے باشندے نہیں سمجھتے تھے۔ کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ کسی قوم کا ہر فرد اپنی زبان کے سارے الفاظ کو سمجھ سکتا ہے۔ اس دعوے کے ثبوت میں ہمارے لئے وہ روایت کافی ہے جو انس بن مالکؓ نے بیان کی ہے کہ ایک آدمی نے حضرت عمر بن الخطابؓ سے قرآن کی آیت "وَفَاكِهَةً وَّاَبًّا" کے متعلق پوچھا کہ "اَبّ" سے کیا مراد ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "ہمیں تکلف اور تعمق سے منع کیا گیا ہے۔" حضرت عمرؓ ہی سے روایت ہے کہ وہ ممبر پر کھڑے ہوئے تھے اور انھوں نے دوران تقریر یہ آیت پڑھی۔ "اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ" پھر انھوں نے لوگوں سے تخوف کے معنی پوچھے۔ بنو ہذیل کے ایک آدمی نے بتایا کہ ہمارے ہاں تخوف کے معنی کم کرتے رہنے اور گھسنے کے ہیں۔ اس کی سند میں اس نے یہ شعر پڑھا۔

تَخَوَّفَ الرَّحْلُ مِنْهَا تَامِكًا قَرِدًا

كَمَا تَخَوَّفَ عُوْدَ النَّبْعَةِ السَّفَنُ

(بڑے بڑے کوہانوں والی اونٹنیوں کو جن کے چھریریاں ہو رہی ہوں کجاوہ اس طرح گھس گھس کر کم کرتا رہتا ہے جیسے کمان کی لکڑی کو ریتی (سوہان) گھس گھس کر کم کر دیتی ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ دین اور علم میں حضرت عمرؓ کا رتبہ کیا تھا مگر انھیں بھی قرآن کے بعض الفاظ کے معانی دوسرے صحابہ سے پوچھنے

[1] مقدمہ صفحہ ۳۶۶

پڑھتے تھے۔ اسی سے دوسرے صحابہ کا اندازہ کر لیجئے۔ اکثر صحابہ آیت کے اجمالی معنوں پر اکتفا کرتے تھے چنانچہ قرآن کی آیت "وَ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا" میں وہ اتنا سمجھ لینے پر اکتفا کرتے تھے کہ اس آیت میں خدا کی نعمتیں شمار کی گئی ہیں۔ وہ اپنے نفسوں پر اس بات کو لازم نہیں سمجھتے تھے کہ وہ تمام آیات کے تفصیلی معانی کو سمجھیں۔

مزید برآں قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کے سمجھنے کے لئے محض زبان کے الفاظ اور ان کے اسلوبوں کو سمجھنا ہی کافی نہیں مثلاً "وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا" "وَالذَّارِيَاتِ ذَرْوًا" کے معانی۔ اور یہ کہ "وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ" میں دس راتوں سے کیا مراد ہے؟ اور "لَيْلَةُ الْقَدْرِ" سے کیا مراد ہے؟ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ اس میں بہت سے اشارے ان چیزوں کی طرف ہیں جن کا ذکر تورات اور انجیل میں آیا ہے اور ان کی تردید مقصود ہے۔ ان آیات کو سمجھنے کے لئے محض زبان جاننا کافی نہیں ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ...... الآية

خدا وہ ہے جس نے اے پیغمبر اسلام! تم پر الکتاب نازل کی ہے۔ اس کی کچھ آیات محکمت ہیں اور وہی کتاب کا اصل الاصول ہیں اور دوسری آیات ملتی جلتی سی ہیں۔ جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ کی خواہش اور ان کا مطلب متعین کرنے کی خاطر ان ملتی جلتی آیات کے پیچھے لگ جاتے ہیں حالانکہ ان کا مطلب خدا اور راسخین فی العلم کے سوا کوئی نہیں جانتا...... الخ

واقعہ یہ ہے کہ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن کو سمجھنے کی قدرت اور اس کے معانی و مطالب کی معرفت میں بڑا تفاوت رکھتے تھے۔

رسول اللہ صلعم کے عہد میں پورے قرآن کو حفظ کرنے کا رواج نہیں تھا جیسا کہ آگے چل کر ہوا۔ اس زمانہ میں لوگ ایک سورت یا چند آیتیں یاد کر لیا کرتے اور ان کے مطالب و معانی کو سمجھ لیا کرتے تھے جب انہیں اس میں مہارت حاصل ہو جاتی تو آگے بڑھتے اور اس طرح کچھ اور سورتیں سیکھ لیا کرتے تھے۔ اس طرح قرآن کریم کا حفظ صحابہ پر منقسم تھا۔ ابو عبد الرحمٰن سلمیؒ کا بیان ہے کہ ہم سے ان لوگوں نے بیان کیا ہے جو قرآن کریم کو پڑھتے تھے (جیسے حضرت عثمان بن عفان اور عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما وغیرہ) کہ جب وہ نبی اکرم صلعم سے کچھ آیتیں پڑھ لیتے تھے تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک علم و عمل کی وہ تمام باتیں نہ جان لیں جو ان آیات میں ہوتی تھیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی آدمی سورہ بقرہ اور آل عمران پڑھ لیا کرتا تھا تو ہماری نگاہوں میں اس کی عزت بہت بڑھ جایا

کرتی تھی۔ یہ روایت امام احمد نے مسند میں بیان کی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کو صرف سورۂ بقرہ کو یاد کرنے میں آٹھ سال لگ گئے تھے۔[1] یہ اسی وجہ سے تھا کہ ابن عمرؓ اس طرح حفظ کرتے تھے کہ جب تک اچھی طرح سمجھ نہیں لیتے تھے ایک آیت سے دوسری آیت کی طرف منتقل نہیں ہوتے تھے۔

×

قرآن کریم میں بہت سی آیات محکم اور واضح المعنیٰ ہیں۔ یہ وہ آیتیں ہیں جن کا تعلق اصول دین اور اصول احکام سے ہے۔ خصوصیت کے ساتھ مکی آیتیں جو اصول دین کی طرف دعوت دیتی ہیں جیسے سورۂ انعام وغیرہ۔ اس قسم کی آیات کو جمہور عوام سمجھ سکتے ہیں خصوصیت کے ساتھ وہ لوگ جو اپنے سلیقہ کے اعتبار سے عرب ہوں۔ قرآن کریم میں بعض آیات ایسی بھی ہیں جن کے معانی دقیق ہیں۔ انہی آیات کو متشابہ کہا گیا ہے ان کو سمجھنا دشوار ہے۔ ان کو سمجھنا خاص لوگوں ہی کا کام ہوتا ہے۔

صحابہ کو عموماً قرآن کے سمجھنے کی زیادہ قدرت تھی۔ کیونکہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا تھا اور انھوں نے ان حالات کا مشاہدہ کیا تھا جن میں قرآن نازل ہوا تھا۔

صحابہ کا قرآن فہمی میں تفاوت

اس کے باوجود قرآن کے سمجھنے میں ان میں اپنے مدارج کے اعتبار سے اختلاف تھا کیونکہ قرآن کو سمجھنے کے اسباب وذرائع سب کو یکساں حاصل نہیں تھے۔ یعنی

(۱) عربی زبان کو جاننے میں ان میں باہم تفاوت تھا۔ اگرچہ عربی ان سب کی زبان تھی۔ مگر ان میں کچھ تو ایسے لوگ تھے جو ادب جاہلی کے اچھے عالم تھے اور غریب الفاظ کو جانتے تھے اور اس طرح قرآن کے مفردات کو سمجھنے کی زیادہ صلاحیت رکھتے تھے۔ ان میں سے دوسرے لوگ وہ تھے جو ان چیزوں میں پہلے لوگوں سے کمتر تھے۔ اور

(۲) صحابہ میں وہ لوگ بھی تھے جو ہمیشہ رسول اللہ صلعم کے ساتھ رہے اور ان اسباب کا مشاہدہ کرتے رہے جن کے بارہ میں آیات نازل ہوتی تھیں۔ دوسرے وہ صحابہ تھے جنھیں یہ مواقع حاصل نہیں تھے۔ اسباب نزول کی معرفت آیت کا مقصود سمجھنے میں بڑی مددگار ہوتی ہے۔ اور ان اسباب سے ناواقفیت بسا اوقات انسان کو غلطی میں ڈال دیتی ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے قدامۃؓ بن مظعون کو بحرین کا گورنر بنایا تو جارودؓ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ قدامہ نے شراب پی ہے اور انھیں نشہ ہو گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کا گواہ کون ہے؟ جارود نے کہا کہ میرے اس بیان پر ابو ہریرہؓ شہادت دیں گے۔ حضرت عمرؓ نے کہا: اے قدامہ! میں تمھارے کوڑے ماروں گا۔ اس پر قدامہ نے کہا کہ خدا کی قسم جیسا یہ لوگ کہہ رہے ہیں اگر میں نے شراب پی بھی ہے تب بھی آپ کو یہ حق نہیں کہ آپ میرے کوڑے ماریں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ کیوں؟ قدامہ نے کہا: اس لئے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

---

[1] اتقان ص ۲۰۰ ج ۲

لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا ؕ

ان پر کوئی مضائقہ نہیں ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اگر وہ کچھ چکھ لیں جبکہ وہ قانون خداوندی کی نگہداشت کرتے رہے ہوں اور ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں۔ پھر قانون خداوندی کی نگہداشت کریں اور ایمان لائیں۔ پھر قانون خداوندی کی نگہداشت کریں اور حسن کارانہ کام کریں)

اور میں انہی لوگوں میں سے ہوں جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے پھر قانون خداوندی کی نگہداشت کی اور ایمان لائے، پھر قانون خداوندی کی نگہداشت کی اور حسن کارانہ کام کئے۔ میں رسول اللہ صلعم کے ساتھ جنگ بدر، جنگ احد، جنگ خندق اور تمام غزوات میں شریک رہا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کوئی شخص ان کو جواب کیوں نہیں دیتا؟ تو ابن عباسؓ نے کہا کہ یہ آیتیں ان لوگوں کے عذر کے طور پر نازل ہوئی تھیں جن کا شراب کی حرمت نازل ہونے سے پہلے انتقال ہو چکا تھا اور باقی ماندہ لوگوں پر حجت ہیں۔ کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! واضح رہے کہ شراب، جوا، بتوں کے چڑھاوے اور پانسے، سب کے سب گندگی کی چیزیں اور شیطانی کام ہیں)۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے ابن عباسؓ تم نے سچ کہا۔ ایک آدمی ابن مسعودؓ کے پاس آکر کہنے لگا کہ مسجد میں ایک آدمی قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کر رہا ہے وہ اس آیت "یَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیْنٍ" کی تفسیر میں کہہ رہا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کے سامنے ایک دھواں آئے گا جس سے انکے سانس گھٹ جائیں گے حتیٰ کہ انہیں زکام سا ہو جائے گا۔ اس پر ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ کسی کو کچھ معلوم ہو تو اسے وہ بیان کرنا چاہیئے لیکن جسے معلوم نہ ہو اسے کہہ دینا چاہیئے کہ خدا زیادہ جاننے والا ہے۔ اس آیت کے متعلق واقعہ یہ ہے کہ قریش نے جب رسول اکرم صلعم کی نافرمانی کی تو آپ نے انہیں سالہائے یوسفؑ کی طرح کے قحط زدہ سالوں کی بددعا دی چنانچہ انہیں قحط اور مشقت نے آپکڑا حتیٰ کہ وہ ہڈیاں کھانے پر مجبور ہوئے۔ ان دنوں کی بات ہے کہ آدمی آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتا تھا تو اسے بھوک کی مشقت کی بنا پر اپنے اور آسمان کے درمیان بجز ایک دھوئیں کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔[۱]

(۳) عربوں کے گفتار و کردار میں ان کی عادتوں کو جاننے میں بھی اختلاف تھا۔ جو لوگ مثلاً زمانہ جاہلیت میں عربوں کے حج کی عادات و رسوم کو جانتے تھے وہ بہ نسبت ان لوگوں کے جو ان کی عادات کو نہیں جانتے تھے حج کی آیات کو زیادہ سمجھ سکتے تھے۔ یہی حال ان آیتوں کا

---

[۱] موافقات ص ۳۰۱ ج ۳ و مابعد

ہے جو عربوں کے دیوتاؤں اور دیویوں اور عربوں کے طریقۂ عبادت کے بارہ میں نازل ہوئی ہیں کہ ان کو مکمل طور پر وہی لوگ سمجھ سکتے تھے جو جانتے تھے کہ عرب کے لوگ کیا کچھ کیا کرتے تھے۔

(۳) قرآنی آیات کے نازل ہونے کے زمانہ میں جزیرۂ عرب میں یہود و نصاریٰ کیا کچھ کیا کرتے تھے۔ ان کا جاننا بھی ضروری ہے کیونکہ قرآن کی بہت سی آیات میں انہی کے اعمال کی طرف اشارہ ہے اور انہی پر رد کیا گیا ہے۔ ان آیات کو اس وقت تک سمجھنا بہت ہی دشوار ہے جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ یہود و نصاریٰ کیا کچھ کیا کرتے تھے۔ نیز صحابہ کے درمیان فہم و بصیرت کے لحاظ سے بھی بہت تفاوت ہوتا تھا اور تابعین اور تابعین کے بعد کے لوگوں میں یہ تفاوت اور بھی شدید ہو گیا تھا۔

٭

سرچشمہ ہائے تفسیر

یہاں تفسیر سے مراد تفسیر بالمنقول ہے جس سے علماء کی مراد (اولاً) وہ تفسیر ہے جو خود رسول اللہ صلعم سے نقل کی گئی ہے۔ مثلاً حضور اکرم صلعم سے منقول ہے کہ اَلصَّلٰوۃُ الْوُسْطٰی سے مراد نماز عصر ہے۔ یا حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلعم سے پوچھا کہ یَوْمِ الْحَجِّ الْاَکْبَرِ سے کیا مراد ہے تو آپ نے فرمایا کہ یوم النحر مراد ہے۔ یا یہ کہ رسول اللہ صلعم سے پوچھا گیا کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنے خسر سے معاہدہ کرکے کونسی مدت کو پورا کیا تھا۔ (آٹھ سال یا دس سال)

تفسیر بالروایت

آپ نے فرمایا کہ وہ مدت پوری کی تھی جس میں پوری پوری ادائیگی اور وسعت تھی (یعنی دس سال کی مدت) اس طرح کی بہت سی روایات ہیں جو صحاح ستہ کی کتابوں میں منقول ہیں۔ ان روایات میں قصہ گو لوگوں اور روایتیں گھڑنے والوں نے بہت کچھ اضافے بھی کئے ہیں علمائے حدیث نے ان پر تنقید کی ہے۔ کچھ روایات کو انھوں نے صحیح اور کچھ کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اس امر کی دلیل کہ اس باب میں موضوع روایات بہت داخل ہوئی ہیں یہ ہے کہ ایک ہی آیت کی تفسیر میں دو دو متناقض تفسیریں نقل کی گئی ہیں جو ناممکن ہے کہ رسول اللہ سے صادر ہوئی ہوں۔ مثلاً حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلعم سے اَلْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَۃِ مِنَ الذَّھَبِ وَالْفِضَّۃِ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ قنطار ایک ہزار اوقیہ کو کہتے ہیں۔ مگر دوسری طرف ابوہریرہؓ سے نقل کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ قنطار بارہ ہزار اوقیہ کو کہتے ہیں[1]۔ بلکہ اس بناء پر بعض علماء نے تو سرے سے اس باب کا انکار ہی کر دیا ہے یعنی انھوں نے ان روایات کی صحت ہی کا جو محدثین اس باب میں بیان کرتے ہیں سرے سے

تفسیری روایات قابل اعتماد نہیں

انکار کیا ہے۔ چنانچہ امام احمد ابن حنبل سے روایت ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ تین بابوں کی کوئی اصل نہیں ہے۔ تفسیر۔ ملاحم اور مغازی[2]۔ اس بات کی دلیل کہ خود مفسرین نے اس باب میں نقل شدہ روایات پر اعتماد نہیں کیا یہ ہے کہ وہ ان تفسیروں پر ترک کر کے سے نہیں ہو گئے جو روایات کے ذریعہ سے ان تک پہنچی

---

[1] پہلی حدیث کو حاکم نے اور دوسری حدیث کو احمد اور ابن ماجہ نے بیان کیا ہے۔

[2] اتقان ص ۲۱۱ ج ۲۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امام احمد کے شاگردوں میں سے محققین نے کہا ہے کہ امام صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے زیادہ تر روایتوں کی صحیح اور متصل سندیں نہیں ہیں۔

تھیں بلکہ اس کے ساتھ ہی انھوں نے وہ تفسیریں بھی بیان کی ہیں جن تک انھیں خود ان کے اجتہاد نے پہنچایا تھا۔ اگر روایات کی تفسیریں ان کے نزدیک صحیح ہوتیں تو نقل کے ذریعہ ایک تفسیر معلوم ہو جانے کے بعد ان کو ٹھہر جانا چاہیے تھا اور خود اپنی رائے سے کوئی تفسیر بیان کرنے کی جرأت نہ کرنی چاہیے تھی مگر مفسرین نے ایسا نہیں کیا۔

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا منقول تفسیر کا مجموعہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ بعد میں اس مجموعہ میں وہ تفسیریں بھی شامل ہو گئیں جو صحابہ تابعین اور دوسرے ائمہ سے منقول تھیں حتیٰ کہ ابتدائی زمانہ کی تمام تفسیر کی کتابیں اسی نہج پر مرتب کی گئی ہیں۔

تفسیر بالرائے

(دوم) اجتہاد بھی تفسیر کے سرچشموں میں سے ہے۔ اسے آپ "رائے" بھی کہہ سکتے ہیں۔ مفسر عربی زبان اور عربوں کے اسلوب بیان سے واقف ہو۔ عربی الفاظ اور ان کے معانی کو وہ جانتا ہو اور اسے یہ معلوم ہو کہ یہ الفاظ جاہلی اشعار وغیرہ میں کہاں کہاں اور کس کس انداز سے استعمال ہوئے ہیں۔ صحیح اسناد کے ساتھ آیات کے اسباب نزول کے بارہ میں جو روایات پائی جاتی ہیں اسے ان کا بھی علم ہو۔ ان تمام اسباب کے مہیا ہو جانے کے بعد وہ اپنے اجتہاد سے قرآنی آیات کی تفسیر کرتا ہے۔ زیادہ تر صحابہؓ اسی طریقہ سے قرآن کی تفسیر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ سے جو تفسیریں منقول ہیں وہ اسی قسم کی تفسیریں ہیں۔ مثال کے طور پر آپ دیکھئے کہ آیت "وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ" کی تفسیر میں مفسرین نے الطُّور کے لفظ کی مختلف تفسیریں کی ہیں۔ چنانچہ مجاہد نے الطُّور کی تفسیر مطلقاً پہاڑ سے کی ہے۔ لیکن ابن عباسؓ نے ایک خاص پہاڑ کے ساتھ کی ہے۔ دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ الطُّور اس پہاڑ کو کہتے ہیں جس پر سبزہ اُگا ہوا ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ خشک اور ننگے پہاڑوں کو الطُّور نہیں کہتے۔ آپ نے دیکھا کہ تفسیروں کا یہ اختلاف دراصل رائے میں اختلاف کا نتیجہ ہے منقولات میں اختلاف کا نتیجہ نہیں ہے جیسا کہ الفاظ کے معانی میں اختلاف کا آپ نے یہ ایک نمونہ دیکھا ہے اسی طرح یہ حضرات آیات کے مطالب بیان کرنے میں بھی مختلف راستے اختیار کرتے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ صحابہ اور تابعین دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں ایک گروہ ایسا بھی موجود تھا جو قرآن کے بارے میں

تفسیر بالرائے کے متعلق صحابہ کے مختلف نظریات

اپنی رائے سے کچھ کہنے سے احتراز کرتا تھا۔ چنانچہ سعید بن المسیب کے متعلق نقل کیا جاتا ہے کہ جب ان سے قرآن کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ فرمادیا کرتے "میں قرآن کے بارہ میں کچھ نہیں کہتا" ابن سیرین کہتے ہیں کہ میں نے عبیدہ سے قرآن کی کوئی بات پوچھی تو وہ کہنے لگے۔ خدا سے ڈر اور درستگی کو ہاتھ سے نہ دے۔ وہ لوگ گذر گئے جنھیں معلوم تھا کہ قرآن کن کن حالات و ظروف میں نازل ہوا تھا" ہشام بن عروہ ابن الزبیر سے نقل کیا جاتا ہے کہ وہ کہتے تھے "میں نے اپنے والد کو کبھی نہیں دیکھا کہ انھوں نے کتاب اللہ کی کسی آیت کا مطلب اپنی طرف سے بیان کیا ہو" لیکن ان کے پہلو بہ پہلو وہ حضرات بھی تھے جو اسے جائز سمجھتے تھے بلکہ جہاں تک ان کا اجتہاد انھیں پہنچاتا تھا اسے بیان نہ کرنے کو کتمان علم سمجھتے تھے۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ابن مسعودؓ ابن عباسؓ اور عکرمہ وغیرہ کی رائے یہی تھی۔ البتہ یہ اور ان جیسے دوسرے لوگ اس بات کو بُرا سمجھتے تھے کہ صلاحیت اور اسباب نہ رکھتے ہوئے

کوئی شخص قرآن کی تفسیر بیان کرنے کی جرأت کرے۔ مثلاً کسی شخص کو عربی زبان کی اتنی معرفت حاصل نہیں ہے کہ وہ بات کو صحیح طور پر سمجھ سکے یا اس نے قرآن کو اس انداز سے نہیں پڑھا کہ اس کی مجمل چیزوں کو مفصل چیزوں پر محمول کر سکے ایسے لوگوں کو تفسیر قرآن کی جرأت نہیں کرنی چاہیے۔ ایسے ہی وہ اسے بھی برا سمجھتے تھے کہ کوئی شخص دینی مذاہب میں سے کسی خاص مسلک کا پیرو ہو جائے مثلاً اعتزال، ارجاء، تشیع وغیرہ اور پھر اپنے اس عقیدہ کو اصل قرار دے کر قرآن کی تفسیر اس کے مطابق کرنے لگے۔ حالانکہ ضروری یہ ہے کہ عقیدہ کو قرآن کے تابع رکھا جائے۔ یہ نہیں کہ قرآن کو اپنے تابع کر دیا جائے۔

یہ اجتہاد ہی تھا جو صحابہ اور تابعین کے درمیان الفاظ اور آیات قرآنیہ کی تفسیر میں وسیع اختلافات کا موجب بن گیا جس کا مظاہرہ آپ کو ابن جریر طبری کی تفسیر کے قریب قریب ہر صفحہ پر نظر آ سکتا ہے۔

جاہلی ادب، شعر میں ہو یا نثر میں، جاہلیت میں اور ابتدائے اسلام میں عربوں کے عادات اور ان کے رسم و رواج، حوادث و وقائع جو عربوں کو پیش آئے وہ عداوتیں، منازعتیں، ہجرت، جنگ اور فتنے جو رسول اللہ صلعم کو پیش آئے۔ وہ واقعات جو رسول اللہ صلعم کی حیاتِ طیبہ کے دوران میں اور آیات قرآنی کے نزول کا موجب بنے، غرضیکہ تمام چیزیں علمائے صحابہ اور تابعین کے لئے وہ سرچشمہ تھیں جن سے وہ قرآن کی تفسیر پر قدرت حاصل کرنے میں مدد لیتے تھے۔

اسرائیلیات

تفسیر کے سرچشموں میں ایک اور سرچشمہ بھی تھا جس سے مفسرین نے بکثرت مدد لی ہے۔ بات یہ ہے کہ عقول کے ضعف اور مکمل معلومات حاصل کرنے کے شوق نے لوگوں کو قرآن کی بہت سی آیتوں کو سننے کے بعد اس طرف دعوت دی کہ وہ اپنے آس پاس کے لوگوں سے ان کے متعلق سوالات کریں۔ چنانچہ جب انھوں نے اصحاب کہف کے کتے کا ذکر سنا تو کہنے لگے ..... اس کا کیا رنگ تھا؟ جب انھوں نے فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا سنا تو ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ وہ بعض کون سا حصہ تھا جس سے مقتول کی میت کو چھوا گیا تھا؟ نوح علیہ السلام کی کشتی کتنی بڑی تھی؟ اس لڑکے کا کیا نام تھا جسے ایک نیک بندہ نے موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں قتل کر دیا تھا؟ جب ان کے سامنے فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ پڑھا جاتا تھا تو وہ کہنے لگتے۔ ان پرندوں کی انواع کیا تھیں؟ وہ ستارے کون سے تھے جنھیں یوسف علیہ السلام نے اپنے خواب میں دیکھا تھا؟ ایسے ہی جب وہ شعیب علیہ السلام کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں قرآنی آیات سنتے تھے تو پوچھتے تھے کہ دونوں مدتوں میں سے موسیٰ علیہ السلام نے کونسی مدت پوری کی تھی؟ اور موسیٰ علیہ السلام نے ان کی چھوٹی صاحبزادی سے شادی کی تھی یا بڑی سے؟ اسی طرح جب انھیں قرآن کریم میں ابتداء آفرینش کا کوئی اشارہ ملتا تھا تو باقی قصہ کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتے تھے۔ ایسے ہی جب ان کے سامنے کوئی ایسی آیت آتی تھی جس میں کسی نبی کے متعلق کسی حادثہ کا بیان ہوا تھا تو وہ اس حادثہ کی تفصیلات کے پیچھے پڑ جاتے تھے۔ جو چیز لوگوں کی اس علمی طمع کو پورا کر سکتی اور ان کی تشنگی کو فرو کر سکتی تھی وہ محض تورات اور اس کے متعلقہ حواشی اور شروح ہی ہو سکتی تھیں۔ بلکہ وہ افسانے اور کہانیاں بھی جو اس سلسلہ میں گھڑی گئی تھیں۔ کچھ یہودی مسلمان ہو چکے تھے۔ ان کے ذریعہ سے نامحسوس طریقہ پر یہ تمام معلومات مسلمانوں میں گھستی چلی آئیں اور قرآن کی تفسیر میں داخل ہوتی چلی گئیں۔ اس میں بڑے بڑے صحابہ مثلاً ابن عباسؓ وغیرہ نے بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھا کہ وہ کہ لیتے

بڑے بڑے صحابہ نے اسرائیلیات کو بیان کرنے میں باک نہیں کیا

خیال میں اس طرح تو وہ قرآن کی شرح و توضیح کو مکمل کر رہے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا تھا کہ جب تم سے اہل کتاب کوئی بات بیان کریں تو نہ اس کو سچ سمجھو نہ جھوٹ۔ لیکن عمل اس کے بالکل برعکس تھا۔ یہ حضرات ان کی باتوں کو سچ سمجھتے اور ان سے نقل کرتے تھے۔ اس کے نمونے کے طور پر تمہارا جی چاہے تو طبری وغیرہ کی ان روایات کو پڑھ جاؤ جو انھوں نے قرآنی آیت هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ کی تفسیر میں بیان کی ہیں۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ کعب الاحبار کے پاس اٹھتے بیٹھتے اور ان سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ اس بارہ میں مجھے ابن خلدون کا یہ قول بہت ہی پسند ہے کہ "عرب اہل کتاب اور اہل علم نہیں تھے۔ ان پر بدویت اور امیت کا غلبہ تھا۔ جب انھیں کسی ایسی بات جاننے کا شوق ہوتا جن کا نفوس بشریہ کو شوق ہوا کرتا ہے مثلاً سکونات کے اسباب، ابتداء آفرینش، اور وجود کے اسرار وغیرہ تو وہ اہل کتاب ہی کی طرف رجوع کرتے اور انہی سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ یہودیوں سے اہل تورات تھے اور ان کے بعد نصاریٰ تھے۔ اہل تورات جو ان عربوں کے درمیان میں رہتے تھے وہ بھی ان کی طرح کے بدوی تھے۔ انھیں اس قسم کی کچھ زیادہ باتیں معلوم نہیں تھیں۔ وہ اتنا ہی جانتے تھے جتنا عام اہل کتاب جانتے تھے۔ ان کا بڑا حصہ بنو حمیر پر مشتمل تھا جنھوں نے یہودیت کو بطور اپنے دین کے قبول کر لیا تھا۔ یہ لوگ جب مسلمان ہوئے تو اپنی ان تمام داستانوں اور کہانیوں کے ساتھ اسلام میں داخل ہوئے جن کا احکام شرعیہ سے کوئی تعلق نہیں تھا کہ اس میں وہ خاص احتیاط برتتے۔ مثلاً ابتداء آفرینش، انتہاء دنیا اور ملاحم وغیرہ۔ یہ لوگ کعب الاحبار، وہب بن منبہ، عبداللہ بن سلام اور ان جیسے دوسرے لوگ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں تفسیری کتابیں ان منقولات سے بھر گئیں جو ان نو مسلم یہودیوں نے ان سے بیان کی تھیں۔ ان کا تعلق چونکہ احکام سے تو تھا نہیں کہ ان کی صحت کی جانچ پڑتال ضروری سمجھی جاتی کیونکہ احکام پر تو عمل کرنا واجب ہوتا ہے اور ان منقولات کا عمل سے کوئی تعلق نہیں تھا لہٰذا مفسرین نے ان جیسی چیزوں کے نقل کرنے میں کافی تساہل سے کام لیا اور اپنی تفسیری کتابیں اس قسم کی خرافات سے بھر کر رکھ دیں"[1] الخ

اس عہد کے مفسرین

صحابہ میں سے قرآن کی تفسیر بیان کرنے میں بہت تھوڑے سے آدمی مشہور ہیں۔ زیادہ تر جن لوگوں سے قرآن کی تفسیر نقل کی گئی ہے، ان میں سے حضرت علی ابن ابی طالبؓ، عبداللہ ابن عباسؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ اور ابی ابن کعبؓ ہیں اور ان سے کم حضرت زید بن ثابتؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ اور عبداللہ ابن الزبیرؓ ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ہم یہاں صرف ان چار حضرات پر اکتفا کریں جن کا پہلے تذکرہ کیا گیا ہے کیونکہ یہی وہ حضرات ہیں جنھوں نے مختلف شہروں کے مدارس کے لئے تفسیر کی غذا مہیا کی۔ وہ عام صفات جنھوں نے ان مذکورہ بالا چاروں حضرات کو تفسیر میں

---

[1] مقدمہ صفحہ ۳۶۷

تبحر کا درجہ عطا کیا یہ تھیں عربی زبان پر ان کا عبور، کلامِ عرب کے اسالیب کا احاطہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا اس درجہ اختلاط کہ انھیں ان حوادث و وقائع کا پورا علم ہو سکا جن کے بارہ میں آیات قرآنیہ نازل ہوئی تھیں اجتہاد سے ان کا بے وجہ احتیاط نہ برتنا اور جس نتیجہ تک انھیں ان کا اجتہاد پہنچائے اس کو جرأت کے ساتھ ظاہر کر دینا۔ تیسری خصوصیت میں ہم ابن عباسؓ کا استثنار کریں گے کیونکہ انھیں رسول اللہ صلعم کے ساتھ وہ اختلاط نصیب نہیں ہو سکا جو دوسرے حضرات کو حاصل تھا تاہم اس کے عوض میں انھیں اپنے عنفوان شباب میں علمائے صحابہ کے ساتھ ایسا اختلاط حاصل رہا جس نے ایک حد تک اس کمی کی تلافی کر دی کیونکہ ابن عباسؓ نے علمائے صحابہ سے استفادہ کیا تھا اور وہ ان سے روایت کرتے تھے۔ اگر ہم کثرتِ روایات کے

کثرتِ روایات کے اعتبار سے مفسرین صحابہ کی درجہ بندی

اعتبار سے ان چاروں حضرات کی درجہ بندی کرنا چاہیں تو حضرت ابن عباسؓ کا درجہ سب سے اول رہے گا۔ پھر حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا درجہ آئے گا اور ان کے بعد حضرت علی ابن ابی طالبؓ کا اور ان کے بعد ابی بن کعبؓ کا۔ یہ درجہ بندی کثرتِ روایات کی بنا پر ہوگی صحت مرویات کی بنا پر نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے نام سے سب سے زیادہ اور ان کے بعد حضرت علیؓ کے نام سے روایات بہت زیادہ گھڑی گئی ہیں۔ اس کے چند اسباب تھے جن میں سے اہم ترین سبب تو یہ تھا کہ حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ کا تعلق نبوت کے گھرانے سے تھا۔ ان کے ناموں سے روایات گھڑنا ان روایات کو اعتماد

موضوع روایات کی کثرت

اور تقدس عطا کر دیتا تھا جو دوسرے حضرات کے نام سے حدیثیں گھڑنے میں ممکن نہیں تھا۔ علاوہ ازیں حضرت علیؓ کی اپنی ایک جماعت تھی جو دوسرے حضرات کو حاصل نہیں تھی۔ لوگوں نے وہ تمام روایات گھڑ گھڑ کر ان کی طرف منسوب کرنی شروع کر دیں جن کے متعلق انھیں خیال ہوا کہ ان سے حضرت علیؓ کی علمی قدر میں اضافہ ہوگا۔ ابن عباسؓ کی نسل سے خلفاء عباسیہ تھے۔ لوگ ان کے دادا سے بکثرت روایتیں نقل کر کر کے خلفاء کا تقرب حاصل کرتے تھے۔ جی چاہے تو ذرا ابن ابی حمزہ کی یہ روایت حضرت علیؓ سے دیکھئے کہ آپ نے فرمایا۔ "اگر میں چاہوں کہ ام القرآن (سورۂ فاتحہ) کی تفسیر سے ستر اونٹوں کا بوجھ بھر دوں تو میں ایسا کر سکتا ہوں"۔ نیز ابو الطفیل کی یہ روایت دیکھئے کہ میں حضرت علیؓ کے ایک خطبہ میں حاضر تھا جس میں انھوں نے ارشاد فرمایا کہ — "تم مجھ سے کسی بات کے متعلق نہیں پوچھو گے مگر میں تمھیں اس کے متعلق بتا سکوں گا۔ مجھ سے کتاب اللہ کے متعلق پوچھو۔ خدا کی قسم کوئی ایسی آیت نہیں ہے جس کے متعلق میں یہ نہ جانتا ہوں کہ وہ رات کو نازل ہوئی تھی یا دن کو۔ وہ میدان میں نازل ہوئی تھی یا پہاڑی پر۔" ان دونوں روایتوں کو نقل کر دینا ہی غالباً کافی ہوگا ان پر کسی مزید حاشیہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے اس کثرت سے روایات نقل کی گئی ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ آیاتِ قرآنی میں سے کوئی ایک آیت ایسی نہیں نکلے گی جس میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک قول یا چند اقوال مروی نہ ہوں۔ راویوں نے اس کثرت سے روایات نقل کی ہیں کہ وہ حد سے متجاوز ہو گئی ہیں اور ناقدین کو سلسلۂ رواۃ کی تفتیش کرنی پڑی۔ چنانچہ کچھ سلسلوں کو انھوں نے معتبر اور کچھ کو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ معاویہ ابن صالح، عن علی ابن ابی طلحہ، عن

ابن عباسؓ بہترین سلسلۂ اسناد ہے۔ اس پر بخاریؒ نے بھی اعتماد کیا ہے۔ اور جویبر عن ضحاک، عن ابن عباسؓ ناپسندیدہ سلسلۂ اسناد ہے۔ ابن جریج نے روایات کے جمع کرنے میں صحت کا اہتمام نہیں کیا۔ ہر آیت کے متعلق جو کچھ انہیں ملا چاہے صحیح تھا اور چاہے ضعیف سب نقل کر دیا ہے۔ کلبی عن ابی صالح عن ابن عباسؓ سب سے واہیات ترین سلسلۂ اسناد ہے۔ اگر اس کے ساتھ محمد بن مروان سدی صغیر کی روایت بھی مل جائے تو پھر تو وہ محض جھوٹ کا پلندہ ہے۔ (خیر ذالک)

ابن عبد الحکم کی سند سے نقل کیا گیا ہے کہ میں نے امام شافعیؒ کو کہتے ہوئے سنا کہ ابن عباسؓ سے تفسیر میں سو حدیثوں کے لگ بھگ سے زیادہ ثابت نہیں ہے[1]۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حدیثیں گھڑنے والے کس قدر حدیثیں گھڑتے تھے اور حدیثیں گھڑنے پر ان کی جرأتیں کہاں تک پہنچ چکی تھیں۔

ان روایات کے گھڑے ہوئے ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بعض اوقات آپ کو حضرت ابن عباسؓ کی ایسی دو روایتیں ملیں گی جو خود حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی گئی ہوں گی اور دونوں باہم متناقض ہوں گی کہ ان دونوں کو حضرت ابن عباس کی طرف منسوب کرنا صحیح ہی نہیں ہو سکے گا۔ مثلاً ابن جریر طبری میں دیکھئے قرآن کی اس آیت کی تفسیر میں "فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا"۔ معاویہ بن ابی طلحہ سے اور انھوں نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ یہ ایک مثال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان چاروں پرندوں کو کاٹ لو اور پھر ان کو دنیا کے چار کھونٹ میں رکھ دو۔ چوتھائی یہاں اور چوتھائی وہاں۔ پھر ان کو پکارو۔ تو وہ دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ ذرا آگے چل کر ابن جریر کہتے ہیں کہ ہم سے محمد بن سعد نے حدیث بیان کی کہ میرے والد نے مجھ سے بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ میرے چچا نے مجھ سے بیان کیا اور انھوں نے اپنے والد سے بیان کیا کہ ابن عباس فرماتے تھے کہ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ میں صُرْهُنَّ کے معنی یہ ہیں کہ ان کو اچھی طرح باندھ لو[2]۔ ملاحظہ فرمائیے کہ ابن عباسؓ ایک مرتبہ صُرْهُنَّ کی تفسیر یہ فرماتے ہیں کہ ان کو کاٹ ڈالو۔ اور دوسری جگہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ ان کو اچھی طرح باندھ لو۔ یہ بات تکلف کے ساتھ بھی کہیں شکل ہی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے ایک وقت میں یہ تفسیر بیان کی ہو اور دوسرے وقت میں وہ۔ اس کی مثالیں ابن جریر میں بڑی کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

مگر ان موضوع روایات کی بھی اپنی علمی قیمت ہے

یہ الگ بات ہے کہ اس قسم کی موضوع تفسیریں ——— حق بات تو بہر حال کہنی ہی پڑتی ہے ——— اپنی ایک علمی قیمت رکھتی ہیں۔ جو تفسیریں گھڑی جاتی تھیں وہ یونہی بے سروپا باتیں نہیں ہوتی تھیں بلکہ اکثر اوقات یہ موضوع تفسیریں ذہین لوگوں کے اجتہاد کا علمی اور قیمتی نتیجہ ہوتی تھیں۔ ان میں وہ چیز جس کی درحقیقت کوئی قیمت نہیں ہے صرف وہ اسناد ہے جس کے ذریعہ سے انھیں حضرت علیؓ یا ابن عباسؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

---

[1] الاتقان ص ۲۲۵ ج ۲ [2] ابن جریر ص ۳۷ و ۳۸ ج ۳

جب ہم حضرت ابن عباس رضؓ وغیرہ سے منقول تفسیری روایات پر عام نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان کا سرچشمہ وہی تین چیزیں ملتی ہیں جن کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ (۱) رسول اللہ صلعم سے نقل، یا ان حوادث و وقائع کی روایت جو ان کے سامنے پیش آئے تھے جن سے کسی آیت کے معنی کی توضیح ہو جاتی ہو۔ (۲) ادب جاہلی پر اعتماد کرتے ہوئے فہم معنی میں اجتہاد۔ اور عربی زبان، اور عربوں کی عادات اور رسوم و رواج کی معرفت جو زمانۂ جاہلیت اور ابتدائے اسلام میں عام تھیں۔ اور (۳) اسرائیلیات اور ان کے متعلقات

مفسرین تابعین عہد صحابہؓ کے بعد مذکورہ بالا صحابہؓ سے روایت کرنے میں بعض تابعین نے خاص شہرت پائی۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے زیادہ تر مجاہد، عطاء ابن ابی رباح، عکرمہ مولیٰ ابن عباس، اور سعید ابن جبیر نقل کرتے ہیں یہ چاروں حضرات حضرت ابن عباسؓ کے شاگردوں میں سے ہیں جنہوں نے ان سے مکہ میں اکتساب علم کیا تھا اور سب کے سب موالی میں سے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو حضرت ابن عباس سے بکثرت روایت کرتے ہیں اور کچھ کم۔ مجاہد حضرت ابن عباس سے سب سے کم روایت کرتے ہیں اور یہی سب سے زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تفسیر پر امام شافعیؒ اور امام بخاری وغیرہ جیسے اہل علم بھی اعتماد کرتے تھے۔ لیکن بعض علماء ایسے بھی تھے جو مجاہد کی تفسیر کو قبول نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ابن سعد نے اپنی طبقات میں نقل کیا ہے کہ اعمش سے پوچھا گیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ لوگ مجاہد کی تفسیر سے احتراز کرتے ہیں؟ اعمش نے بتایا کہ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ مجاہد تفسیر میں اہل کتاب سے پوچھا کرتے تھے اور ان کی باتیں نقل کیا کرتے تھے[۱]۔ لیکن ہم نے یہ کبھی کو نہیں دیکھا کہ اس نے مجاہد کے صدق و امانت پر طعن کیا ہو۔ اسی طرح عطاء ابن ابی رباح اور سعید بن جبیر بھی قابل اعتماد اور سچے بزرگ تھے۔ رہ گئے عکرمہ تو وہ ابن عباسؓ سے سب سے زیادہ روایتیں نقل کرتے ہیں اور یہ ان کے آزاد کردہ غلام بھی ہیں۔ ان کی اصل مغرب میں بربر سے تھی۔ ان کو قابل اعتماد شمار کرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ کچھ لوگ ان پر اعتماد نہیں کرتے اور نہ ان سے کوئی روایت نقل کرتے ہیں۔ امام بخاری انہیں قابل اعتماد سمجھتے ہیں اور ان سے روایت بھی کرتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ علم میں بڑے جری تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قرآن میں وہ ہر چیز کو جانتے ہیں۔ کسی شخص نے سعید ابن المسیبؒ سے قرآن کی کسی آیت کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ مجھ سے قرآن کی کسی آیت کے متعلق نہ پوچھو اس شخص سے پوچھو جو یہ سمجھتا ہے کہ اس پر قرآن کی کوئی بات مخفی نہیں ہے یعنی عکرمہ سے[۲]۔ عبد اللہ ابن مسعودؓ کے شاگردوں میں سے تفسیر میں عراق کے اندر مسروق ابن الاجدع زیادہ مشہور ہیں یہ عربی النسل ہیں اور قبیلۂ ہمدان سے ان کا تعلق ہے۔ نہایت پرہیزگار، زاہد، ثقہ اور سچے آدمی تھے۔ کوفہ میں رہتے تھے اور شریح قاضی پیچیدہ معاملات و مسائل میں ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ اسی طرح قتادہ ابن دعامہ سدوسی اکمہ کی بھی بڑی شہرت تھی۔ یہ بھی عربی الاصل تھے اور بصرہ میں رہتے تھے۔ تفسیر میں ان کی شہرت عربی زبان پر ان کی قدرت و عبور کی وجہ سے تھی۔ اشعار عرب، ایام العرب اور انساب عرب پر ان کی معلومات

---

[۱] ص ۳۴۳ ج ۵۔ [۲] تفسیر ابن جریر ص ۲۹ ج ۱

نہایت وسیع تھیں۔ قابلِ اعتبار بزرگ تھے تاہم کچھ لوگوں نے ان کی روایتیں بیان کرنے سے احتراز برتا ہے کیونکہ وہ قضا و قدر کے مسائل میں غور و خوض کرتے تھے۔

اس عہد ــــ یعنی تابعین کے عہد ــــ میں اسرائیلیات اور نصرانیات کی وجہ سے تفسیر کا باب بہت ہی ضخیم ہو چکا تھا کیونکہ یہودی اور نصرانی بکثرت اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ لوگوں کو ان یہودی اور نصرانی حوادث و واقعات کی تفصیلات سننے کا شوق تھا جن کی طرف قرآن نے محض اشارہ

عہدِ تابعین میں اسرائیلیات

کرنے پر اکتفا کیا تھا۔ ہم نے تفسیر ابن جریر میں بہت سی ان آیتوں کو تلاش کیا ہے جو بنی اسرائیل کے متعلق وارد ہوئی ہیں تو یکایک ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی تفسیر میں سرتاپا وہ باطل روایات بیان ہوئی ہیں جن کا انحصار محض وہب بن منبہ ہی پر ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہب بن منبہ یمن کے ایک یہودی تھے جو مسلمان ہو گئے تھے۔ وہ یہودی کتابوں اور ان کے قصوں کو بغیر و ثیق اقتباس کے بیان کرتا ہے اور اپنی روایتوں کو علمی رنگ دینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا۔ مسلمانوں نے ان روایتوں کو وہب بن منبہ سے لینے میں کافی تساہل برتا۔ جیسا کہ ابنِ خلدون نے اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے کیونکہ ان روایات کے بیان کرنے پر ان کے خیال میں کسی حکم شرعی کا استنباط مرتب نہیں ہوتا تھا۔ جیسا کہ ہم نے بہت سی ان آیات کو تلاش کیا جو نصاریٰ کے متعلق وارد ہوئی ہیں تو یکایک ہم دیکھتے ہیں کہ طبری کی زیادہ تر روایات ابن جریج سے نقل کی گئی ہیں۔ یہ ابن جریج عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج ہے۔ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں کہتا ہے کہ "یہ رومی نژاد تھے"۔ لہٰذا یہ نصرانی الاصل تھے۔ ان کے متعلق بعض علماء کہتے ہیں کہ وہ حدیثیں وضع کیا کرتا تھا۔ اس نے متعہ کے طریقے سے نوّے عورتوں سے شادی کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ابن جریج پہلا شخص تھا جس نے اسلام میں کتابیں تصنیف کیں[1]۔ ان کی پیدائش سنہ ۸۰ھ میں ہوئی اور تقریباً سنہ ۱۵۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ بہت سے شہروں میں گھومے پھرے۔ ان کی پیدائش مکّہ میں ہوئی اور بصرہ۔ یمن اور بغداد کی طرف سفر کیا۔

صحابہؓ اور کبار تابعینؒ کے عہد کے بعد علماء نے تفسیر کی کتابیں تصنیف کرنا شروع کر دی تھیں۔ مگر ان کا انداز ایک سا ہی ہوتا تھا۔ وہ ایک آیت بیان کرتے تھے اور اس کی تفسیر میں صحابہ اور تابعین سے جو کچھ نقل کیا جاتا تھا اسے سند کے ساتھ بیان کر دیتے تھے۔ جیسے تفسیر سفیان ابن عیینہ۔ تفسیر وکیع ابن الجراح۔ تفسیر عبدالرزاق وغیرہ۔ ہم تک یہ تفسیریں نہیں پہنچ سکیں۔ ہم تک وہ تفسیریں پہنچی ہیں جو اس طبقہ کے بعد کے لوگوں نے تصنیف کیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور ابن جریر طبری کی تفسیر ہے۔

اس کے بعد بھی واضح رہے کہ قرآن کریم کی تفسیر ہر زمانہ میں اپنے دور کی علمی حرکت سے متاثر ہوتی رہی ہے۔

---

[1] ابن خلکان ص ۳۰۰ ج ۱

تفسیر اپنے دور کے نظریات و آراء سے متاثر رہی ہے

ہر زمانہ کی تفسیریں ان علمی آراء و نظریات اور مذاہب دینیہ کا ایک عکس اور یہ تو ہوتی ہیں جو اس زمانہ میں رواج پذیر ہوتے تھے۔ ابن عباس سے لے کر استاذ شیخ محمد عبدہ تک یہی چیز آپ کو نظر آئے گی۔ حتیٰ کہ اگر آپ کسی خاص زمانہ میں تالیف شدہ تمام تفسیروں کو جمع کر لیں تو ان سے آپ اس علمی حرکت کی مقدار کا وضاحت کے ساتھ تعین کر سکتے ہیں جو اس زمانہ میں شائع اور مقبول تھیں اور ان کا بھی جو غیر مقبول تھیں۔

اگر آپ ان تفسیری روایات کو تلاش کریں جو صحابہؓ اور تابعینؒ کے صدر اول کے لوگوں سے نقل کی جاتی تھیں تو آپ ان میں دیکھیں گے کہ وہ حضرات کسی آیت کی تفسیر میں مختصر تر الفاظ میں محض لغوی معنی کی توضیح پر اکتفا کرتے تھے جو انھوں نے آیت سے سمجھے ہیں۔ مثلاً غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ " کی تفسیر میں وہ کہیں گے "کسی معصیت سے تعرض نہ کرنے والے" اور مثلاً حق تعالیٰ کے اس ارشاد " وَ أَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ " کی تفسیر میں وہ بیان کریں گے کہ زمانۂ جاہلیت میں جب کوئی سفر میں باہر جانے کا ارادہ کرتا تو ایک تیر لیتا اور کہتا کہ یہ تیر تو سفر کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اگر یہ تیر نکل آیا تو میرا سفر میں جانا ٹھیک ہے اور مجھے بھلائی حاصل ہوگی۔ اور ایک دوسرا تیر لیتا اور کہتا کہ یہ تیر سفر نہ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اگر یہ تیر نکل آیا تو مجھے سفر میں کوئی بھلائی نہیں ملے گی اور ایک تیسرا سادہ تیر لے لیتا جس پر کوئی نشان نہیں ہوتا تھا۔ حق تعالیٰ نے اس آیت میں اس فعل سے منع فرمایا ہے۔ اگر وہ اس کے ساتھ کچھ اور بھی بیان کرنا چاہتے تو آیت کا سبب نزول بیان کر دیتے تھے لیکن بعد کے مصنفین اور راویوں نے اس میں بڑی وسعت پیدا کر لی تھی۔ چنانچہ بے تکان یہود و نصاریٰ کی روایات بیان کی جانے لگی تھیں۔ لیکن اس دور میں بھی تفسیر میں ان لوگوں کی جانب سے آپ کو کہیں فقہی مسئلہ کے علمی استنباط کا نشان تک بھی نہیں ملے گا اور نہ ہی کسی دینی مسلک کی تائید۔ لیکن اس کے بعد کے زمانہ میں جبکہ تقدیر وغیرہ کے مسائل پر بحثیں ہونے لگی تھیں آپ دیکھیں گے کہ لوگوں کو در اصل یہ مذاہب ہی تفسیریں لکھنے پر راغب کرتے تھے۔ ہر شخص اپنے مذہب اور مسلک ——— جبر و اختیار وغیرہ ——— کے مطابق تفسیریں کرنے لگا تھا۔ پھر جب فقہی حرکت شاندار طریقہ پر شروع ہوئی تو آپ مفسرین فقہاء کو دیکھیں گے کہ وہ آیات کو بیان کرنے لگتے ہیں تو ان سے جو فقہی احکام مستنبط ہوتے ہیں ان کو بھی ذکر کرتے جاتے ہیں بالکل یہی کچھ قواعد نحو، قواعد بلاغت، اور قواعد اخلاق کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے۔

ان کتابوں کی فہرست جن سے اس باب کی تدوین میں مدد لی گئی ہے

الاتقان فی علوم القرآن

المستصفیٰ للغزالی

الموافقات للشاطبی

طبقات المفسرین محمد بن علی الداؤدی المالکی (دار الکتب کا قلمی نسخہ)

کشف الظنون

طبقات ابن سعد

تفسیر ابن جریر

مقدمہ ابن خلدون

تذکرۃ الحفاظ للذہبی

ابن خلکان

اسلامی معاشرت

از ـــــ پرویز

مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کیلئے قرآن کے ارشادات۔ بالخصوص

عورتوں بچوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کیلئے

اس سے بہتر کتاب آپ کو نہیں ملے گی ـــــ قیمت دو روپے

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گل برگ کالونی - لاہور

نقد و نظر

۱۔ مذاہبِ عالم

ہمارے ہاں علمی افلاس کا یہ عالم ہے کہ مدتیں گذر جاتی ہیں کہ کوئی کام کی کتاب سامنے آئے۔ لیکن بعض اوقات کوئی ایسی کتاب بھی شائع ہو جاتی ہے جو اس کمی کو پورا کر دیتی ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب اسی قسم کی ہے یہ زمانہ جمہوریت کا ہے۔ اور جمہوریت میں "تعداد" کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زندہ قوموں نے اپنے ہاں اعداد و شمار (statistics) کے محکموں کو رگِ جان کی حیثیت دے رکھی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اس کی طرف کسی کی توجہ ہی نہیں۔ ("ہمارے ہاں" سے مراد کم و بیش تمام مسلم ممالک ہیں)۔ اس کا نتیجہ ہے کہ زندگی کے دوسرے شعبے تو ایک طرف ہمیں آج تک متعین طور پر اس کا بھی علم نہیں کہ کرۂ ارض پر مسلمانوں کی کل آبادی کتنی ہے۔ ہمارے متعلق اعداد و شمار غیروں کے مرتب اور مہیا کردہ ہیں جن کے پیشِ نظر اپنے اپنے سیاسی اور معاشی مفاد ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے مسلمانانِ عالم نے جس قدر نقصان اٹھایا ہے۔ اور اٹھاتے چلے جا رہے ہیں؛ اس کا اندازہ شاید آنے والا مورخ ہی لگا سکے گا۔

صحیح اعداد و شمار مہیا اور مرتب کرنے کے لئے جس قدر وسیع معلومات کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ اور جب یہ کام پہلی مرتبہ ہاتھ میں لیا جائے تو اس کے لئے جتنی جانکاہ محنت و مشقت درکار ہوتی ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بالخصوص ایسی جگہ جہاں نہ آسانی سے کتابیں مل سکتی ہوں۔ نہ جدولیں۔ نہ براہ راست معلومات فراہم کرنے کا کوئی موثق ذریعہ ہو نہ اس کام کے سلسلے کسی طرف سے کوئی خاص تعاون یا امداد۔

یہ تھے وہ حالات جن میں ہمارے محترم دوست، احمد عبداللہ المسدوسی نے اس امر کا تہیہ کیا کہ وہ مسلمانِ عالم کی آبادی۔ رقبۂ زمین۔ سیاسی قوت۔ معاشی ذرائع و وسائل پیداوار۔ معدنی ذخائر وغیرہ کے متعلق صحیح صحیح اعداد و شمار فراہم کر کے ان کا مقابلہ دنیا کے دیگر مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ کریں گے۔ اور اس طرح قوم کے سامنے ایک ایسا آئینہ پیش کریں گے جس میں اسے اپنے صحیح خدوخال نمایاں طور پر نظر آجائیں اور ساری دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اس قوم کی صحیح پوزیشن اور حقیقی مقام کیا ہے۔ ہم حیران تھے کہ تمام مذاہبِ عالم کے پیروؤں کے متعلق اس قدر وسیع معلومات کہاں سے دستیاب اور کیسے مرتب ہوں گی؛ اور جو کام ایک بہت بڑے ادارے کے کرنے کا ہے، اسے ایک فرد (تنہا) کس طرح سرانجام دے سکے گا۔ لیکن مسدوسی صاحب کو جہاں سوادِ فیض کی طرف سے

ذوق تجسس کی شدت عطا ہوئی ہے وہاں ہمت و استقلال سے بھی بہرہ وافر ملا ہے۔ چنانچہ وہ ایک عرصہ تک اس بحر ذخار میں غوطہ زن رہے اور جب اس سے باہر آئے ہیں تو ان کے ہاتھ میں (قریب) پانچ سو صفحے کی یہ کتاب تھی جس میں دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کے متعلق نہ صرف وہ تمام معلومات ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے بلکہ ان میں سے ہر ایک کا سیاسی اور معاشی نقطۂ نگاہ سے تاریخی اور تقابلی تعارف بھی کرا دیا گیا ہے اور پھر باہمی تقابل سے بتایا گیا ہے کہ فطرت کی طرف سے جو کچھ مسلمانوں کو ملا ہے، اور جس پر آج بھی وہ قابض ہیں، اگر وہ اسے صحیح استعمال میں لائیں تو اقوام عالم میں ان کا مقام کیا ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کی وضاحت کے لئے کتاب میں بے شمار جدولیں، خاکے اور ضمیمے شامل کئے گئے ہیں۔ کتاب کا سب سے دلچسپ اور عبرت آموز باب وہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ بھارت کے ہندوؤں نے، اپنی تعداد کو، مسلمانان عالم کی تعداد سے بھی زیادہ ظاہر کرنے میں کس کس قسم کی غلط بیانیوں، فریب کاریوں اور افترا پردازیوں سے کام لیا ہے۔ اور وہ اس وقت ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں سے بالخصوص اور دیگر اقلیتوں سے بالعموم اس باب میں کیا کچھ کر رہے ہیں۔ ہندوؤں کا نام ہم نے اس لئے خصوصیت سے لیا ہے کہ وہ اس میدان میں اوروں سے آگے ہیں۔ ورنہ وہ کونسی قوم ہے جو مسلمانوں کے متعلق غلط بیانیوں سے کام نہیں لیتی۔ ابھی تین سال اُدھر کا ذکر ہے کہ امریکہ سے شائع ہونے والے رسالہ لائف میں دنیا کے بڑے بڑے مذاہب سے متعلق ایک سلسلۂ مضامین شائع ہوا تھا جس میں عیسائیوں کی تعداد نوے کروڑ۔ ہندوؤں کی اکتیس کروڑ سے زائد اور مسلمانوں کی تیس کروڑ ظاہر کی گئی تھی۔ لیکن اب سعودی صاحب نے (دلائل و شواہد) بتایا ہے کہ عیسائیوں کی تعداد چھپن کروڑ۔ بدھوں کی صرف پندرہ کروڑ۔ ہندوؤں کی بائیس کروڑ۔ اور مسلمانوں کی باون کروڑ ہے۔ پھر سن لیجئے کہ مسلمانان عالم کی تعداد باون کروڑ سے زائد اور تمام دنیا کی آبادی کا ۲۲% ہے۔ ان کے رقبے کی وسعت تین کروڑ، پچاس لاکھ، نوے ہزار مربع کیلومیٹر ہے۔ اور متحدہ اقوام کی جنرل اسمبلی میں ان کے ارکان کی تعداد ۱۰ (۲۲%) ہے، جبکہ وہاں ہندوؤں کا صرف ایک ممبر ہے۔

کتاب کے ایک ضمیمے میں ایک تفصیلی مقالہ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے شامل کیا گیا ہے کہ اسلام کی رو سے، مسلمان اور عیسائی ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ اس ضمن میں یہاں تک لکھ دیا گیا ہے کہ

> دراصل یہ احکام آخری دین کی بصیرت کی علامت ہیں کیونکہ وہ علم الٰہی پر مبنی تھے جس سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ تھی (جیسا کہ تاریخ سے ظاہر ہوتی ہے کہ) انسانیت کی تاریخ میں انہی دونوں مذاہب (اسلام اور عیسائیت) کو اہم کردار ادا کرنا ہے۔ چنانچہ گذشتہ چودہ صدیوں کی تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ قیادت عالم کا منصب انہی دونوں سامی اقوام اور الہامی مذاہب کے پیروؤں کو حاصل رہا ہے اور باوجود باہمی تنازعہ کے ان دونوں نے انسانیت کے قافلے کی منزل مقصود کی طرف راہ نمائی کی ہے اور تہذیب کو ترقی دی ہے۔ اور اگر یہ دونوں باہمی غلط فہمیوں کو نظر انداز کرکے لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ (تمہارا مذہب تمہیں مبارک اور ہمارا ہمیں) کے اصول رواداری پر عمل کریں تو کوئی شبہ نہیں کہ بنی نوع انسان کی ترقی و تحفظ میں پوری اور مثبت کامیابی حاصل کرسکتے ہیں (صفحہ [illegible])

ہمارے نزدیک قرآن کے نقطۂ نگاہ سے، یہ پوزیشن صحیح نہیں۔ اگر عیسائیت یا دنیا کا کوئی اور سینہ آسمانی مذہب (جس شکل میں وہ نزولِ قرآن کے وقت موجود تھا)، کاروانِ انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود کی طرف لے جانے کی صلاحیت رکھتا، تو نزولِ قرآن کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ علاوہ بریں، عیسائیت کے متعلق جس خوش فہمی کا اظہار کیا گیا ہے' اس کا دعویٰ تو خود ان عیسائیوں کو بھی نہیں جو اس کا مطالعہ غیر جانبداری اور کشادہ نگہی سے کرتے ہیں۔

بہر حال یہ ایک ضمنی پہلو تھا۔ جہاں تک زیرِ تبصرہ کتاب کے اساسی موضوع کا تعلق ہے' ان معلومات کی حامل کتاب' اردو تو ایک طرف، دنیا کی کسی زبان میں بھی نہیں ملے گی۔ ہم محترم مسعودی صاحب کو ان کی اس کامیاب کوشش پر مستحق تبریک سمجھتے ہیں۔ کتاب کے آئندہ ایڈیشن کے سلسلہ میں ہمارا مشورہ ہے کہ کتاب ٹائپ میں چھپوائی جائے (اس میں کتابت کی غلطیاں نسبتاً کم رہتی ہیں اور کتاب صاف بھی چھپتی ہے)، اور اس کا نام کچھ اور رکھا جائے کیونکہ موجودہ نام کتاب کے مشمولات کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا۔

کتاب مکتبہ خدام ملت کراچی نے شائع کی ہے اور قیمت (مجلد) بارہ روپیہ ہے۔

۲۔ عمر فاروق اعظم

ہمارے نزدیک ایسا کہنے میں قطعاً کوئی مبالغہ نہیں کہ اگر حضور رسالتمآب شاہکارِ خداوندی ہیں تو حضرت عمرؓ شاہکارِ رسالت ہیں یعنی اگر دیکھنا ہو کہ جس ذات کی تربیت براہِ راست خدا کی زیرِ نگرانی ہو وہ شرفِ و مجدِ انسانیت کے کس معراجِ کبریٰ پر فائز ہوتی ہے، تو اس کی بلند ترین مثال، حضور رسالتمآبؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔ اور اگر یہ دیکھنا ہو کہ جس شخص کی صلاحیتوں کی نشو و نما تربیتِ نبوی کی رہینِ کرم ہو، وہ دنیا میں کتنا بڑا صالح انقلاب برپا کر سکتا ہے تو اس کی عظیم مثال حضرت عمرؓ ہیں۔ قرآن نوعِ انسانی کے لئے ایک ضابطۂ حیات ہے جس سے ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل ہوتی ہے جس میں انسانیت برھتی، پھولتی اور پھلتی ہے۔ اس معاشرہ کی تخم ریزی نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی اور عہدِ فاروقی میں یہ پروان چڑھا۔ لہٰذا اگر یہ سمجھنا ہو کہ دین کا عملی مفہوم کیا ہے؟ اور جو معاشرہ اس کے متعین کردہ خطوط پر متشکل ہوتا ہے اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں، تو اس کے لئے عہدِ نبویؐ سے عہدِ فاروقؓ تک کی تاریخ کا غائر مطالعہ نہایت ضروری (بلکہ لابدیک) ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اُس زمانے کی تاریخ، خود اُس زمانے میں مرتب نہ ہوئی۔ اسے مؤرخین نے صدیوں بعد، انفرادی طور پر مرتب کیا۔ اس لئے اس میں غلط اور صحیح ہر قسم کا مواد جمع ہو گیا۔ اس پر مزید ستم ظریفی یہ کہ ان مؤرخین کے گرد تقدس کا ایسا ہالہ کھینچ دیا گیا جس سے ان کی کوششوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنا اور پرکھنا گناہِ عظیم قرار پا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ کہ ان کتبِ تاریخ میں جو کچھ جمع ہو گیا اسے مقدس سند کا درجہ حاصل ہو گیا اور یہی وہ چیز ہے جو دین کے صحیح تصور کو سامنے لانے اور دوسروں کے سامنے پیش کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن چکی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اُس عہد کے تاریخی سرمایہ کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور چھان پھٹک کر غلط کو صحیح سے الگ کر دیا جائے۔ کہا جائے گا کہ آج ہمارے پاس وہ کونسا ذریعہ ہے جس سے اس قسم کی تحقیق و تنقید کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر معاملہ کسی عام زمانے کی تاریخ کا

ہوتا تو اس قسم کی کسوٹی کا ملنا ناممکن تھا۔ لیکن جس دور کی تاریخ کے متعلق ہم گفتگو کر رہے ہیں اس کے بارے میں ہم، عام مؤرخین اور محققین کے مقابلہ میں بہت خوش قسمت واقع ہوئے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اس دور میں نظام زندگی قرآن کے مطابق تھا اور قرآن ہمارے پاس حرفاً حرفاً محفوظ ہے۔ لہٰذا اس دور کی تاریخ کو قرآن کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لیا جائے۔ جو باتیں اس کے مطابق ہوں انہیں صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ جو اس کے خلاف ہوں انہیں غلط قرار دے دیا جائے۔ اس طرح اس دور کی ایسی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس عہد کی زندگی کا صحیح نقشہ پیش کرتی ہے۔ یہی وہ تاریخ ہوگی جس کی روشنی میں دین کا صحیح صحیح مفہوم سامنے آسکے گا۔ ہماری تاریخ کی اس قسم کی تنقید و تنقیص اور اس کے بعد ایک جدید تاریخ کی تدوین و ترتیب کا کام تو معلوم کب شروع ہوگا لیکن ہمارے زمانے میں، ایک نئی کوشش شروع ہوئی ہے جو اس کام میں آسانیاں پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔ اس کوشش سے مقصود یہ ہے کہ ہمارا تاریخی مسالہ (Material) جو بے شمار قدیم کتابوں میں بے ترتیبی سے بکھرا پڑا ہے، اسے ترتیب نو دے کر سائنٹفک طریق سے پیش کیا جائے۔ ہمارے ہاں اس کی داغ بیل علامہ شبلی مرحوم نے ڈالی تھی۔ لیکن مصر میں جن ارباب قلم نے اسے وسعت دی ہے ان میں احمد امین اور محمد حسین ہیکل کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔ (ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا انداز مختلف ہے اس لئے ہم نے اسے ان کے زمرے میں شامل نہیں کیا)۔ ان میں احمد امین کا مقام مقابلۃً اونچا ہے۔ ہیکل نے اس سلسلہ میں حضور نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ (حیات محمدؐ) اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے کوائف زندگی الگ الگ مجلدات میں شائع کئے ہیں۔ سیرت فاروقی دو جلدوں پر مشتمل ہے جس کا اردو ترجمہ زیر تبصرہ ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ حبیب اشعر صاحب نے کیا ہے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ بڑی خوبی سے کیا ہے۔ مکتبہ جدید (لاہور) نے اسے ایک ضخیم جلد میں شائع کیا ہے اور بڑی عمدگی سے شائع کیا ہے۔ کتاب بڑے سائز کے ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت (مجلد) بیس روپے ہے۔ اس کتاب میں حضرت عمرؓ کی زندگی (قبل از اسلام کی زندگی سے شہادت (بلکہ اس کے بعد بیعت حضرت عثمانؓ) تک کے واقعات بڑی تفصیل سے جمع کر دیئے گئے ہیں اور اس اعتبار سے یہ اردو زبان کے لٹریچر میں گرانقدر اضافہ ہے۔ کتاب کے ابتدائی اکیس ابواب واقعات پر مشتمل ہیں اور آخری باب شہادت سے متعلق ہے۔ ان کے درمیان تین ابواب ہیں حضرت عمرؓ کی حکومت۔ عہد فاروقی میں اجتماعی زندگی اور حضرت عمرؓ کے اجتہاد پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ حصہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں منجملہ دیگر امور یہ بتایا گیا ہے کہ اس دور میں امور مملکت کے فیصلوں کے لئے (جسے قانون سازی کہا جانے لگا) قاعدہ یہ تھا کہ قرآن کو اساس و بنیاد مانا جاتا تھا۔ باقی رہے وہ فیصلے جو عہد رسالتمآب اور زمانہ حضرت ابوبکر صدیقؓ میں ہوتے تھے ان میں جو احکام عہد فاروقی کے تقاضوں کو پورا کرتے تھے انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جاتا تھا۔ اور جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہوتی تھی ان میں مناسب تبدیلی کر لی جاتی تھی۔ اس ضمن میں ہیکل لکھتے ہیں۔

> رسول اللہ پر مکمل ایمان ہونے کے باوجود انہوں نے (حضرت عمرؓ نے) وقت کی ضرورت اور سنت ثابتہ کا فرق کبھی فراموش نہ ہونے دیا۔ بلکہ کبھی کبھی تو وہ سنت پر نظرثانی کو بھی ممکن سمجھتے تھے۔ اور اپنے اس یقین کے تحت کہ اگر رسول اللہ اس وقت موجود ہوتے تو اپنے فیصلے سے رجوع فرما لیتے۔ اسے سنت سے انکار پر محمول نہیں کرتے

سکتے ہیں (صفحہ ۵۸)

جہاں تک نظام ربوبیت کا تعلق ہے (کہ جو اسلامی مملکت کا مقصود و منتہیٰ ہے) ہیکل نے وضاحت سے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے رجسٹر مرتب کر دیئے جن کے مطابق تمام افراد کے وظائف مقرر کئے گئے تھے اور ہر بچے کا پیدائش کے ساتھ وظیفہ مقرر ہو جاتا تھا۔ اس ضمن میں حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد بھی درج کیا گیا ہے کہ

اگر میں دولت کی فراوانی تک زندہ رہا تو ہر مسلمان کا وظیفہ تین ہزار درہم تک کر دوں گا۔ ایک ہزار اس کے جانوروں اور ہتھیاروں کے لئے۔ ایک ہزار خود اس کے لئے۔ اور ایک ہزار اس کے اہل و عیال کے لئے۔ (صفحہ ۱۱۵)

جب سواد عراق کی زمین قبضے میں آئی اور یہ تجویز پیش ہوئی کہ اسے سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے تو حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ اگر زمین کو افراد کی ملکیت میں دیدیا گیا تو

سرحدوں کی حفاظت کیسے ہوگی اور عراق اور شام کے شہروں کی بیواؤں اور یتیموں کی کفالت کیسے کی جا سکے گی

(صفحہ ۹۹)

یہ اور اس قسم کے متعدد واقعات درج کتاب ملتے ہیں۔ جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس دور میں قرآنی نظام کو کس شکل میں عملاً نافذ کیا گیا تھا۔

لیکن کتاب کا کمزور حصہ وہ ہے جس میں ان روایات کو بلا تنقید درج کر دیا گیا ہے جو صریحاً قرآن کے خلاف جاتی ہیں۔ مثلاً

(۱) رسول اللہ کی وفات کے بعد جب پہلی مرتبہ خلافت کا سوال سامنے آیا تو (تاریخ میں ہے کہ) انصار نے تجویز کیا کہ ایک خلیفہ ان سے اور ایک مہاجرین سے منتخب کر لیا جائے۔ اس پر حضرت عمرؓ کا "ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور بول اٹھے۔

ایک وقت میں دو امیر جمع نہیں ہو سکتے۔ خدا کی قسم عرب تمہاری سیادت ہرگز تسلیم نہیں کریں گے جبکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام تم میں سے نہیں تھے۔ وہ تو انہی کو اپنا امیر مانیں گے جن میں نبوت تھی۔ اس روشن دلیل اور اس نمایاں اقتدار سے جو کوئی انکار کرے گا ہم اس سے لڑیں گے۔ ہم محمدؐ کے عزیز و اقارب ہیں۔ جو کوئی امارت و اقتدار کے مسئلہ میں ہم سے جھگڑے گا وہ باطل کی طرف لیجانے والا۔ گناہ کی طرف ڈھکیلنے والا اور ہلاکت کی دلدل میں پھنسنے والا ہوگا۔" (صفحہ ۹۶)

صاف ظاہر ہے کہ یہ روایت وضعی ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ حضرت عمرؓ، جو قرآن پر اتنی غائر نگاہ رکھتے تھے، خلافت کے معاملہ میں ایسی دلیل پیش کریں جو قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہو، اور جس سے دین کی جڑ کٹ جاتی ہو۔ بادنیٰ تعمق یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ یہ روایت کس مقصد کے ماتحت وضع کی گئی تھی۔

(۲) روایات میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں قرآن کریم کا کوئی مرتب نسخہ امت کے پاس موجود نہیں تھا۔ جب

جنگ یمامہ میں بہت سے حفاظ شہید ہو گئے تو حضرت عمرؓ کو خدشہ پیدا ہوا کہ اس طرح قرآن ضائع ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ قرآن جمع کرنے کا کام ہاتھ میں لیا جائے۔

ہیکل نے جمع القرآن کے اس قصے کو بھی اپنے ہاں اسی طرح درج کر دیا ہے حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم کو نبی اکرمؐ خود مرتب نسخہ کی شکل میں امت کو دیکر گئے تھے۔

(۳) ایک جگہ ہیکل نے لکھا ہے۔

اس کے بعد معراج کا واقعہ پیش آیا اور خود مسلمانوں کی ایک جماعت اسلام سے کٹ گئی۔ (صفحہ ...)

یہ بھی ایک افسانہ نظر آتا ہے۔

(۴) عقیدتمندانہ تعبیر نے اس قسم کی بہت سی روایات وضع کر رکھی ہیں کہ قرآن کے احکام حضرت عمرؓ کی منشا کے مطابق نازل ہوا کرتے تھے۔ ہیکل نے ان روایات کو بھی اپنے ہاں درج کر دیا ہے۔

جب ہنوز امتناع خمر (شراب) کا حکم نازل نہیں ہوا تھا تو حضرت عمرؓ نے شراب کے نقصانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا کہ "اے اللہ ہمیں شراب کے متعلق کچھ بتا"۔ چنانچہ اس پر یسئلونک عن الخمر و المیسر ..... (۲) کی آیت نازل ہوئی۔ لوگ اس پر بھی شراب سے باز نہ آئے تو حضرت عمرؓ نے پھر عرض کی "اے اللہ شراب کے بارے میں ہمیں ہدایت دے"۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یا ایہا الذین آمنوا لا تقربوا الصلوۃ و انتم سکاری ..... (۴) لیکن لوگ اس پر بھی شراب سے نہ رکے تو حضرت عمرؓ نے بارگاہ الٰہی میں پھر درخواست کی۔ "اے اللہ ہمیں شراب کے بارے میں مفصل ہدایت دے کہ یہ عقل اور مال دونوں کی دشمن ہے"۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یا ایہا الذین امنوا انما الخمر و المیسر و الانصاب و الازلام رجس من عمل الشیطان ..... (۵) (صفحہ ...)

اسی طرح پردے کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہؐ سے کہا کہ "آپ کے پاس اچھے برے سبھی قسم کے لوگ آتے ہیں بہتر ہے آپ امہات المومنین کو پردے کا حکم فرما دیں"۔ اس پر آیت حجاب نازل ہوئی۔ (صفحہ ...)

(۵) ایک طرف تو حضرت عمرؓ کی بصیرت کے متعلق اس قسم کی روایات بیان کی جاتی ہیں جن کے پیش نظر ہیکل انہیں "الہامی شخصیت" کا مالک قرار دیتا ہے۔ اور دوسری طرف روایات یہ بھی کہتی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنی شہادت سے کوئی چار روز قبل ایک خطبہ دیا جس میں منجملہ دیگر امور فرمایا کہ

> کلالہ سے زیادہ اہم میرے نزدیک کوئی مسئلہ نہیں۔ میں نے رسول اللہؐ سے جتنی بار کلالہ کے متعلق گفتگو کی ہے کسی چیز کے متعلق نہیں کی۔ اور میں نے جب سے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر رہنا شروع کیا تھا آپ نے جتنی ناراضی کا اظہار

ملہ اس قسم کی اصطلاحات غلط فہمی پیدا کرنے کا موجب ہو جاتی ہیں اس لئے ان سے اجتناب انسب ہے۔ (طلوع اسلام)

کلالہ کے بارے میں فرمایا ہے اور کسی چیز کے بارے میں نہیں فرمایا۔ یہاں تک کہ میرے پیٹ میں انگلیاں چبھو کر مجھے فرمایا: عمر سورۃ نساء کی آخری آیت کو اپنے لئے کافی سمجھو۔ اور اگر میں زندہ رہا تو اس سلسلہ میں ایسا فیصلہ کردوں گا جس سے وہ لوگ بھی جو قرآن پڑھتے ہیں اور وہ بھی جو قرآن نہیں پڑھ سکتے فیصلہ کر سکیں گے۔" (صفحہ ۹۰)

اس روایت کو دیکھئے اور اپنا سر دھنئے۔ کلالہ کے متعلق قرآن کریم میں حکم موجود ہے۔ (اس روایت کے مطابق) حضرت عمرؓ زندگی بھر کوشش کرنے کے باوجود اس حکم کا مفہوم نہیں سمجھ سکے۔ وہ رسول اللہؐ سے بار بار دریافت کرتے رہے لیکن رسول اللہؐ نے بھی بات نہ سمجھائی۔ بلکہ ہمیشہ ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ اور یہ کچھ اس مسئلہ کے متعلق ہوا جس کی اہمیت کا احساس حضرت عمرؓ کو زندگی کے آخری دنوں تک برابر رہا۔ نیز اس سے یہ بھی مترشح ہوا کہ قرآن کی آیات بابت کلالہ کا مفہوم صحابہؓ میں سے بھی کوئی نہیں سمجھتا تھا۔ ورنہ حضرت عمرؓ انہی سے دریافت کر لیتے۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے!

(۲) ہیکل نے اس روایت کو بھی درج کتاب کر دیا ہے۔

رسول اللہؐ نے حضرت ابوہریرہؓ کو اس اعلان کے لئے بھیجا کہ جس نے تہ دل سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہہ دیا اسے جنت کی بشارت دی جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے یہ اعلان سنا تو حضرت ابوہریرہؓ کو سختی کے ساتھ رسول اللہ کی خدمت میں واپس بھیج دیا اور اس بات کی تصدیق کے لئے کہ بشارت کا یہ اعلان واقعی ارشاد نبوی کے تحت عمل میں آیا ہے خود بھی ان کے پیچھے پیچھے گئے۔ پھر جب رسول اللہؐ نے جواب اثبات میں مرحمت فرمایا تو عرض کیا کہ ایسا نہ کیجئے۔ مجھے ڈر ہے۔ لوگ اس پر تکیہ کر کے بیٹھے رہیں گے۔ انھیں عمل کرنے دیجئے۔ نبیؐ نے ان کی رائے کو شدت پسندیدگی عطا کرتے ہوئے فرمایا۔ ٹھیک ہے۔ انہیں عمل کرنے دو۔ (صفحہ ۹۱)

اس سے حضرت عمرؓ کی عظمت تو یقیناً سامنے آجاتی ہے لیکن خود ذات رسالتمآب (علیہ التحیۃ والسلام) کی جو حیثیت رہ جاتی ہے کاش اس کا بھی کسی کو احساس ہو جاتا!

(۳) ایک جگہ لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے تمام سرداروں کو حکم دے دیا تھا کہ

وہ مرتدین سے اسلام کے سوا کوئی پیش کش قبول نہ کریں۔ جو کوئی انکار کرے اس سے لڑیں۔ اور جو ہاتھ آجائے اسے نہ چھوڑیں۔ انھیں قتل کریں۔ ان کے گھروں کو آگ لگا دیں۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیں (صفحہ ۔۔)

(۴) واقعہ قرطاس کے سلسلہ میں حسب ذیل روایت بھی کتاب میں درج کر دی گئی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا۔ جب رسول اللہؐ اس دنیا سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے فرمایا۔ "لاؤ میں تمہیں ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہیں ہو گے۔" عمرؓ نے کہا۔ اس وقت رسول اللہؐ پر مرض کی شدت ہے۔ تمہارے پاس قرآن موجود ہے۔ اور کتاب اللہ ہمارے لئے کافی ہے۔ اہل بیتؓ نے

اختلاف کیا اور جھگڑنے لگے۔ ان میں سے کسی نے کہا۔ کاغذ لاؤ۔ رسول اللہؐ تمہارے لئے ایک ایسی تحریر رقم فرمائیں گے جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے اور کچھ لوگوں نے حضورؐ کی بات دہرائی۔ جب حضور رسالتمآبؐ میں تنازعہ کا شور بلند ہوا تو آپ نے فرمایا۔ "میرے پاس سے چلے جاؤ۔ حضرت ابن عباسؓ کہا کرتے تھے کہ مسلمانوں کی انتہائی بدبختی تھی کہ ان کے اختلاف اور شور سے رسول اللہؐ وہ تحریر رقم نہ فرما سکے۔ یوں غیب کا حال تو خدا ہی جانتا ہے مگر وہ ایک وحی تھی جو اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمائی تھی کہ اگر حضورؐ وہ تحریر رقم فرما دیتے تو مسلمان یقینی طور پر گمراہ نہ ہوتے اور اُمت اللہ کے ارشاد وَلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ... کے تقاضے سے نکل کر اس کے قول اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّکَ کے تحت آجاتی۔ لیکن جیسا کہ اللہ پہلے ہی جانتا تھا اسے منظور ہی یہ تھا کہ دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں میں بھی اختلاف پیدا ہو (صفحہ ۱۰۶)

غرضیکہ اس قسم کی اکثر روایات کتاب میں درج کر دی گئی ہیں۔ اور اس کی وجہ وہی ہے جس کا ہم نے شروع میں ذکر کیا ہے کہ یہ لوگ عہد محمد رسول اللہ والذین معہ کی تاریخ کو قرآن کی روشنی میں نہیں پرکھتے۔ غلط اور صحیح سب جمع کر دیتے ہیں۔ تاریخ کو قرآن کی روشنی میں پرکھنا تو ایک طرف، یہ حضرات بعض قرآنی آیات کا مفہوم بھی وہی لیتے ہیں جو عام کتب تفاسیر میں منقول چلا آ رہا ہے حالانکہ وہ مفہوم قرآن کی تعلیم کے خلاف ہوتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں بھی کتاب میں موجود ہیں۔

بہرحال، جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے، یہ کتاب اس اعتبار سے مفید ہے کہ اس میں بہت سا تاریخی مسالہ ایک ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ اس سے ان لوگوں کو آسانی ہو جائے گی جو تاریخ کو قرآن کی روشنی میں پرکھنے کا کام شروع کریں گے دیکھیں یہ سعادت کس کے حصے میں آتی ہے۔

ہیکل نے زیرِ نظر کتاب میں، اپنی سابقہ تالیف، سیرت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بھی جا بجا حوالے دیئے ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ بھی مکتبہ جدید کی طرف سے پہلے شائع ہو چکا ہے۔ وہ چھوٹی تقطیع کی قریب پونے سات صفحات کی (ٹائپ میں طبع شدہ) کتاب ہے اور قیمت دس روپے ہے۔

۳۔ حیدرآباد دکن۔ کی چند کتابیں

جن سربرآوردہ لوگوں نے، ہندوستان کے مسلمانوں کو، انگریزی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد ہندوؤں کی محکومیت میں زندگی بسر کرنے پر ذہنی طور پر تیار کیا تھا، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کا نام سرفہرست دکھائی دے گا۔ مسلمانوں کا ایمان ہے (اور یہ ایمان حقیقت پر مبنی ہے) کہ خدا کی طرف سے سچا دین صرف اسلام ہے اور دنیا کا کوئی مذہب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ ہندو، اپنی محکوم قوم کی طرف سے، اس قسم کے عقیدہ کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہے کہ ہندو جانتا تھا کہ دنیا کے تقاضوں کے پیش نظر اسے مسلمانوں کو عقیدہ کے اظہار کی آزادی دینی ہوگی۔ اس متصادم صورت حالات سے عہدہ برآ ہونے کیلئے

مہاتما گاندھی نے یہ چال سوچا کہ اس عقیدے کو عام کیا جائے کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں اور کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت اور افضلیت حاصل نہیں۔ آنے والی نسلوں کے دل میں اس عقیدہ کو جاگزیں کرنے کے لئے انہوں نے ایک تعلیمی اسکیم وضع کی جو واردھا کی تعلیمی اسکیم کے نام سے مشہور تھی اور جس کی رو سے بچوں کے نصاب میں اس عقیدے کو داخل کر دینا مقصود تھا۔ جہاں تک موجودہ مسلمانوں کا تعلق تھا، ان کے دل سے اسلام کی افضلیت کا خیال نکال دینے کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی مشہور تفسیر (سورۂ فاتحہ) شائع کی جس میں سارا زورِ بیان اس نظریہ کے اثبات میں صرف کیا گیا تھا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ اس تفسیر کا ہندی ترجمہ (اسی زمانے میں) کانگریس کی طرف سے شائع ہوا تھا۔

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ہندوستان میں تحریکِ آزادی زوروں پر تھی۔ آزادی ملنے کے بعد وہاں کے مسلمانوں کو سچ مچ ہندو کی غلامی میں رہنا پڑ گیا۔ اب انہیں وہاں کیا کچھ کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے اس کے متعلق وہاں کی جماعتِ اسلامی کے ماہنامہ زندگی (رامپور) کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔ وہ ایک معاصر کے جواب میں لکھتا ہے۔

> کیا معاصر "جن۔ گن۔ من" کے قومی ترانے کے مطلب سے بے خبر ہے۔ کیا اسے گاندھی جی کی مشرکانہ اور ہندوانہ پرارتھنا کا علم نہیں جو مختلف تقریبات کے موقع پر گائی جاتی ہے اور جس میں مسلمان خوشی خوشی حصہ لیتے ہیں۔ ابھی ۱۵ اگست [illegible] کو یومِ آزادی کی تقریبات کے سلسلے میں رامپور جیسے اکثریت کے شہر میں مسلمان اساتذہ کے زیرِ اہتمام مسلمان بچوں نے یہ پرارتھنا کی ہے۔ کیا گاندھی جی کے مجسمے کی نقاب کشائی اور ان کی سمادھی پر پھول چڑھانے کی رسم میں مسلمانوں کو شرکت نہیں کرنی پڑتی اور وہ شرکت نہیں کرتے؟ ہمارے [illegible] جیسے خالص دیوبندی ادارے کے علمائے کرام کو مختلف تقریبات کے موقع پر گاندھی سمادھی پر حاضر ہونا پڑتا ہے اور شہر کے بعض کانگریسی مسلمان اس سمادھی کا باقاعدہ طواف کرتے ہیں۔ کیا معاصر کو یو۔ پی کے بیسک اسکولوں کے سرکاری نصاب کی بھی اطلاع نہیں جس کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہندو مسلم تمام بچوں کو بھارت کی پراچین سبھیتا (قدیم آرین تہذیب) کے رنگ میں رنگ دیا جائے اور وہ سب ہندوانہ اور مشرکانہ خیالات لے کر اٹھیں۔[1]
>
> (بحوالہ صدق۔ لکھنؤ۔ مورخہ [illegible])

ان حالات کے لئے فضا کو زیادہ سازگار بنانے کے لئے ضروری تھا کہ مولانا آزاد (مرحوم) کے پیش کردہ نظریہ کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے۔ چنانچہ حیدرآباد (دکن) سے حال ہی میں جو چند کتابیں موصول ہوئی ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے ہندوستان میں ایک اسکیم کو عملاً جامہ پہنایا [illegible] طے کیا گیا کہ مولانا آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ کا انگریزی میں

---

[1] یہ اسی جماعتِ اسلامی کے آرگن کا بیان ہے جو تحریکِ پاکستان کے دوران میں مطالبۂ پاکستان کو غیر اسلامی تصور قرار دے کر یہ کہا کرتی تھی کہ ہم ہندوستان میں رہ کر ہندوؤں کو بھی مسلمان بنا سکیں گے۔

ترجمہ شائع کیا جائے اور اس کے ساتھ ہی اس کا ملخص بھی۔ چنانچہ یہ دونوں چیزیں مولانا کے زیر نگرانی تیار ہوئیں لیکن قبل اس کے کہ یہ شائع ہوتیں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان میں سے ملخص کو پہلے شائع کر دیا گیا ہے جس کا نام ہے۔

Basic Concepts Of Quran

یہ کتاب "دی اکادمی آف اسلامک اسٹڈیز" (حیدرآباد۔ دکن) کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ طباعت بڑی عمدہ ضخامت قریب ایک سو بیس صفحات۔ قیمت ساڑھے چھ روپے (ہندوستانی)۔ چونکہ مولانا آزاد (مرحوم) کی تفسیر سورۂ فاتحہ پر طلوع اسلام میں مبسوط تنقید شائع ہو چکی ہے (رجاب پرویز صاحب کے مجموعہ مضامین "فردوس گم گشتہ" میں شامل ہے) اس لئے ہم اس ملخص پر الگ تبصرہ ضروری نہیں سمجھتے۔ بجز اس کے کہ یہ صاحب کتاب مولانا آزاد کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں ڈاکٹر سید عبداللطیف جیسا مترجم مل گیا۔ مولانا آزاد کی کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ ان کی تحریر کی خصوصیت، خطابت اور شوکت الفاظ ہے۔ جو بات ایک سطر میں بآسانی کہی جا سکتی ہے وہ اس کے لئے صفحوں پر صفحے لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اس انبار میں سے مضمون کی سوئی تلاش کر کے اسے انگریزی قالب میں ڈھالنا کارے دارد۔ اس کے لئے ڈاکٹر صاحب کو جس قدر کاوش کرنی پڑی ہوگی اس کا ہمیں احساس ہے۔ اگر حالات سازگار ہوتے تو ان کی یہی صلاحیتیں اور کاوشیں بڑے مفید نتائج مرتب کرتیں۔

(۲) اسی سلسلہ کی ایک کتاب

The Gita and The Quran

ہے جسے "انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز" حیدرآباد (دکن) نے شائع کیا ہے۔ (قیمت ساڑھے چھ روپے ہندوستانی) اصل کتاب پنڈت سندر لال جی کی تصنیف ہے جسے انگریزی کا لبادہ سید اسد اللہ (مرحوم) نے پہنایا ہے۔ کتاب کا متن اس کے عنوان سے ظاہر ہے۔ یعنی وہی بھگت کبیر کا مسلک کہ

جمنا ایک۔ گھاٹ بہتیرے۔

رام بھی وہی۔ رحیم بھی وہی۔ گیتا بھی وہی۔ قرآن بھی وہی۔ ہندوستان کی سیکولر حکومت میں اور کہا بھی کیا جا سکتا ہے؟

(۳) اسی مجلس کی طرف سے دوسری کتاب شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے۔

The India of yesterday

اسے ڈاکٹر سید محمود نے اردو میں لکھا تھا اور سید اسد اللہ نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اصل کتاب یکسر جیل میں ۱۹۲۲ء میں لکھی گئی تھی اور مقصد اس سے اس خلیج کو پاٹنا تھا جو تاریخی نقطۂ نگاہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں حائل ہو رہی تھی۔ کتاب کی قیمت تین روپے

لہ پرویز صاحب کی یہ تنقید اس زمانہ میں عربیۃ معارف میں شائع ہوئی تھی جب مولانا آزاد کی تفسیر پہلی بار شائع ہوئی تھی۔

ہے۔

(۳) مذکورہ صدر مجلس کی طرف سے ایک ضخیم کتاب

An Outiine Of The Cultural History Of India

بھی موصول ہوئی ہے۔ اس موضوع پر مختلف اہل قلم حضرات کے مقالات کو یک جا مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب نے اسے حسن سلیقہ سے ایڈٹ کیا ہے۔ یہ وہی کتاب ہے جس میں طلوع اسلام کی انقلاب آفریں تحریک کا ذکر ہے۔ (اس کا اقتباس طلوع اسلام کی ایک سابقہ اشاعت میں درج کیا جا چکا ہے۔ اس ضمن میں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ ہم نے اس وقت لکھا تھا کہ اس تحریک کا ذکر ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب نے کیا ہے۔ لیکن اب کتاب دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس کا ذکر ڈاکٹر سراحت اللہ خان کے مقالہ میں آیا ہے) کتاب دلچسپ ہے اور جس مقصد کے لئے شائع کی گئی ہے (یعنی ہندوستان کے کلچر کو اجاگر کرنے کے لئے)، اس کے لئے ایک کامیاب کوشش ہے۔ قیمت پندرہ روپے۔

۴۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ

یہ کتاب شائع تو ہوئی تھی ۱۹۵۳ء میں، لیکن ہم تک ابھی پہنچی ہے اور اس کا ہمیں افسوس ہے کہ ہم ایسی اچھی کتاب کے مطالعہ سے اتنے عرصہ تک محروم رہے۔ کتاب میں مصنف کی محنت اور عقیدت کا ہر مقام پر نشان ملتا ہے لیکن نہ اسے محنت نے تھکایا ہے اور نہ ہی عقیدت نے بے راہ رو ہونے دیا ہے۔ اس میں یہ دلائل و شواہد بتایا گیا ہے کہ مسلمانان ہند کی سیاست کو صحیح قالب میں ڈھالنے کے لئے علامہ اقبال نے کیا کچھ کیا اور اس باب میں ان کا ملت پر کس قدر گراں بار احسان ہے۔ عنوان کے اعتبار سے تو کتاب "اقبال کے سیاسی کارناموں" سے متعلق ہے لیکن تفصیل کے اعتبار سے اس میں بیسویں صدی کے نصف اول میں ہندی سیاست کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ان لوگوں کے لئے بھی مفید ہوگی جو اس زمانے کی ہندی (اور پاکستانی) سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک کتاب کے مصنف (محترم محمد احمد خان۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی) اپنی اس کامیاب کوشش پر مستحق مبارکباد ہیں۔ کتاب کاروان ادب، کراچی کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور قیمت (مجلد) چھ روپے ہے۔

۵۔ تاریخ آزاد پٹھان (جلد اوّل)

یہ محترم اللہ بخش یوسفی صاحب کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ "آزاد پٹھان" سے ان کی مراد وہ افغان ہیں جو "افغانستان اور پاکستان کے درمیانی قبائلی علاقوں شمال مغربی صوبہ سرحد اور بلوچستان میں آباد ہیں"۔ کتاب دلچسپ بھی ہے اور پر از معلومات بھی۔ نیز نفسا دیست مزین۔ اس میں دوسروں کو تو ایک طرف، شاید اکثر پٹھانوں کو بھی اپنے متعلق بعض ایسی باتیں ملیں گی جو ان کی معلومات میں اضافہ کریں گی۔ کتاب محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی۔ کراچی ۵ (اقبال کالونی) کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور مجلد کی قیمت چار روپے آٹھ آنے ہے۔

غیر از محل نہ ہوگا اگر ہم اس مقام پر ایک ضروری نکتہ کی وضاحت کر دیں۔ ان اقوام و قبائل کے حالات کی تحقیق جو اسلام کے حلقہ میں داخل ہو چکی ہیں۔ خالص علمی اور تاریخی نقطۂ نگاہ سے ممکن ہے کسی فائدے کا موجب بھی بن جائے۔ لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے (بالخصوص جن حالات میں ہم آج گرفتار ہیں) اس قسم کی کوشش بعض مضر نتائج کا موجب ہوتی ہے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمان، وطن اور نسل کی بنا پر اور ایک ہی ملک میں بسنے والے مسلمان، قبائلی اور خاندانی نسبتوں کی بنا پر، الگ الگ حلقوں میں بٹ رہے ہیں اور اس میں طرۂ فخر محسوس کرتے ہیں۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ یہ ذہنیت یکسر غیر اسلامی اور اس قسم کی تفریق و تمیز غیر قرآنی ہے، اس بنا پر اس وقت کوئی ایسی کوشش جو مسلمانوں کے کسی گروہ کو وطنی یا نسلی اعتبار سے الگ اور ممیز کر کے دکھائے اور ان کے الگ رہنے کے تصور میں پختگی پیدا کر دے، ہماری تباہیوں کے اسباب میں اضافہ کر دے گی۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ کرۂ عالم میں بسنے والے مسلمانوں کے دل سے یہ خیال نکال دیا جائے کہ وہ وطن یا نسل کے اعتبار سے الگ الگ وحدتیں ہیں اس کی بجائے ان کے دل میں یہ خیال راسخ کیا جائے کہ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو جانے سے وطن اور نسل، خون اور رنگ کے تمام امتیازات مٹ جاتے ہیں اور مختلف اقوام و قبائل کے افراد، صرف مسلمان رہ جاتے ہیں۔ مسلمانانِ عالم کو مصری، شامی، ایرانی۔ (یا عربی اور غیر عربی) تفریق اور خود مسلمانانِ پاکستان کو، سندھی۔ پنجابی۔ بنگالی۔ افغانی تمیز نے جس قدر عظیم نقصان پہنچایا ہے وہ کسی دیکھنے والی آنکھ سے پوشیدہ نہیں۔ لہذا ہمارے نزدیک آج وہی قوم درخورِ تحسین ہے جو ان امتیازی خطوط کو مٹانے کے لئے اٹھایا جائے تاکہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

---

(۲) رہبرِ کامل مکتبہ مدرسۃ الاصلاح، کونہ گھنی۔ سورین۔ اعظم گڑھ (بھارت) نے عبد المجید اصلاحی صاحب کی یہ مختصری کتاب، اسلامی مکاتب کے طلباء کے درجہ چہارم کے لئے شائع کی ہے۔ چھوٹی تقطیع ضخامت قریب سو صفحات۔ قیمت (۵۰/)

اس کتاب میں نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ سلیس زبان اور سادہ انداز میں بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ کوشش اچھی ہے لیکن بعض مقامات پر ایسی روایات بھی درج کر دی گئی ہیں جو علاوہ اس کے کہ نبی اکرمؐ کے مقام بلند کی صحیح ترجمان نہیں، بچوں کے ذہن کو توہم پرستی کی طرف لیجانے کا موجب بنتی ہیں۔ مثلاً وہی عام روایت جس کی رُو سے کہا جاتا ہے کہ جب حضورؐ پر پہلی بار وحی نازل ہوئی تو آپ گھبرا گئے۔ ڈر گئے۔ حضرت خدیجہؓ نے سنا تو وہ آپ کو ورقہ بن نوفل (عیسائی) کے پاس لے گئیں اور اس نے بتایا کہ آپ شرفِ نبوت سے سرفراز کئے گئے ہیں۔ آپ سوچئے کہ ایک نبی کو تو اس کا علم و احساس نہ ہو کہ نبوت عطا فرمائی گئی ہے۔ وہ اس سے ڈر اور گھبرا جائے۔ اور ایک عیسائی عالم کے سمجھانے پر اسے اطمینان ہو۔ یا للعجب!

اسی طرح مثلاً یہ روایت کہ

اللہ کا رحمت بھرا پیغام پہنچانے کے لئے ایک دفعہ پیارے نبیؐ کسی میلے میں جا رہے تھے۔ آپ کے ساتھ کچھ اور مسلمان بھی تھے۔ راستہ میں ایک جگہ آپ ٹھہر گئے۔ صبح کو جب آپ نماز پڑھانے لگے تو جنوں کی ایک جماعت اُدھر سے گذری۔ کلام پاک کی مقدس آواز اُن کے کانوں میں پڑی۔ بولے خاموش رہو۔ جب وہ اپنے گھر واپس ہوئے تو بولے۔ بھائیو۔ ہم نے ایک ایسی کتاب سنی ہے جو موسیٰؑ کے بعد اتاری گئی ہے۔ سیدھی راہ دکھاتی ہے۔ بھائیو۔ اس کتاب کے لانے والے کی باتیں سنو۔ اللہ پر ایمان لاؤ۔ اور اس کے عذاب سے بچو (صفحہ ۲۲)

اس مقام پر جب یہ نہ بتایا جائے کہ جنات کی اس جماعت سے مراد صحرانشین عربوں کی جماعت ہے، تو بچوں (اور بڑوں) کے دل میں جو جو خیالات پیدا ہوں گے وہ ظاہر ہیں۔

اسی طرح معراج کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ جبرئیل نے آپؐ کو جگایا۔

خانہ کعبہ میں لوا آئے۔ آپ کا سینہ پھاڑ کر زمزم کے پانی سے دھویا اور پھر بند کر دیا۔ (صفحہ ۱۶)

مصنف نے اس کا خیال ہی نہیں کیا کہ اس قسم کی باتوں سے بچوں کے تصورات اور نفسیات پر اثر کیا پڑے گا۔ جب تک ہم سیرت نبی اکرمؐ کو قرآن کے آئینہ میں پیش نہیں کرتے، اور اس کا مدار (غلط اور صحیح ہر قسم کی) روایات پر رکھتے ہیں، ہم نبی اکرمؐ کے مقام بلند سے نہ اپنوں کو آشنا کر سکتے ہیں نہ غیروں کو۔ بچوں کے لئے سیرت کی کتاب لکھتے وقت ان باتوں کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیئے۔

ہیں آج کیوں ذلیل جو کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

اس اہم سوال کا بصیرت افروز جواب معلوم کرنے کے لئے دیکھئے

اسبابِ زوالِ اُمّت

اپنے موضوع پر ایک ہی کتاب

قیمت:۔ دو روپے

ملنے کا پتہ ـــــــــ ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ گلبرگ۔ لاہور

باب المراسلات

سعد و نحس مردان سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ ایک صاحب سے پچھلے دنوں قوم عاد کے واقعہ میں "منحوس دن" کا ذکر زیر بحث آیا۔ انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ قرآن کریم کی آیت اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ۝ (سورۃ قمر) بتاتی ہے کہ یہ دن اُس وقت بھی منحوس تھا جبکہ اس قوم پر عذاب نازل ہوا تھا اور اسی آیت کی رُو سے یہ دن قیامت تک منحوس رہے گا۔ اپنے جواب کی تائید میں انہوں نے آیت اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (سورۃ دخان) بھی پیش کی اور کہا کہ قرآن کریم کی اس آیت سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ یہ رات قرآن کے نزول کے وقت بھی مبارک تھی اب بھی مبارک ہے اور قیامت تک مبارک رہے گی۔

میں نے اُن سے کہا کہ کوئی دن بذات خود نہ مبارک ہے نہ منحوس۔ اگر کسی دن اللہ کے قانون کے مطابق عمل کیا جائے تو وہ مبارک اور اگر اس کے خلاف عمل کیا جائے تو وہ منحوس۔ قرآن کریم قوم عاد کے ذکر میں جب فرماتا ہے کہ ان پر منحوس دن کو عذاب آیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے اعمال اس عذاب اور منحوس دن کے ذمہ دار ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اگر اُن کے اعمال اچھے ہو جائیں۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے قانون کے مطابق اُن پر اپنی برکتیں نازل فرمانے لگ جائے گا۔ اور یہی منحوس دن مبارک ہو جائے گا۔ اس لئے کوئی دن بذاتہٖ نہ مبارک ہوتا ہے نہ منحوس بلکہ ہمارے اعمال کی وجہ سے وہ اس طرح بن جاتا ہے۔

براہ کرم آپ اس نکتہ کی قرآن کی رُو سے وضاحت فرمائیں۔

طلوع اسلام محترم مستفسر نے ان صاحب کو جو جواب دیا ہے وہ قرآن کی تعلیم کے مطابق ہے، دن اور رات، زمین اور سورج کی گردش سے طبعی طور پر آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان میں فی ذاتہٖ نہ کوئی منحوس ہوتا ہے نہ مسعود۔ سعد و نحس کا یہ تصور مجوس کا پیدا کردہ ہے جو انسان کی تقدیر کو ستاروں کے تابع قرار دیتے ہیں۔ ان کے برعکس قرآن کا ارشاد ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے تاکہ اس سے انسان فائدہ اٹھائے۔ ظاہر ہے کہ جو چیزیں (چاند۔ سورج۔ ستارے۔ بلکہ تمام فضائی کرّے) انسان کے فائدے کے لئے مسخر کر دی گئی ہیں انسان کی تقدیر ان کے تابع

کیسے ہو سکتی ہے؟ انسان کو تو ایسی صلاحیتیں ارزانی کی گئی ہیں جن سے وہ ستاروں کی کائنات کو اپنے تابع (مسخر) کرے۔ اب ان کی اپنی حالت یہ ہے کہ اس کے اپنے مقصد کے تابع مسخر کائنات اس کی قسمت کا کیا فیصلہ کریں گی؟ بقول علامہ اقبالؒ۔

ترے مقام کو انجم شناس کیا سمجھے

کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

افراد اور اقوام کا نفع اور نقصان ان کے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جس دور میں کوئی قوم قوانینِ خداوندی کے اتباع سے اچھے کام کرے اور ان کاموں کا نتیجہ ان کی خوشگواریوں اور سرفرازیوں کی شکل میں برآمد ہو، وہ دور اس قوم کے لئے مسعود و مبارک ہوگا۔ اس کے برعکس، جب ان کی غلط روشِ زندگی کے نتیجے میں ان پر تباہی اور بربادی آئے گی تو وہ وقت ان کے لئے "منحوس" ہوگا۔ عربی زبان میں النحس کے معنی مشقت۔ تکلیف۔ نقصان۔ تھکان۔ تباہی اور تاریک معاملہ کے ہوتے ہیں۔ قوم عاد کو جب ان کی غلط روشِ زندگی کے نتیجے میں تباہ کیا گیا تو اس سلسلہ میں فرمایا کہ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (۵۴/۱۹) "ہم نے ان پر ایک تند ہوا بھیجی۔ اس دن جو ان کی نحوست یا مستقل تباہی کا دن تھا"۔ بات بالکل واضح ہے وہ دن ان کی تباہی کا تھا۔ قوموں کی تباہیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک عارضی جھٹکا جس کے بعد وہ پھر اپنے آپ کو سنبھال لیتی ہیں۔ دوسری مستقل تباہی جس کے بعد وہ دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتیں۔ "نحسٍ مستمر" وہ تباہی تھی جس کے بعد قوم عاد اٹھ ہی نہیں سکی۔

اسی طرح نزولِ قرآن کے سلسلہ میں جو فرمایا کہ إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ (۴۴/۳) تو خیر و برکت کی موجب وہ کتاب (قرآن) ہے جسے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے نازل کیا گیا۔ چنانچہ کئی ایک مقامات پر اسے مبارک کہا گیا۔ مثلاً سورۃ انعام میں ہے وَهَٰذَا كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ (۶/۹۲) سورۃ انبیاء میں ہے۔ وَهَٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ أَنزَلْنَاهُ (۲۱/۵۰) سورۃ ص میں ہے۔ كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ (۳۸/۲۹)۔ اس نسبت سے، وہ رات جس میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا، نوعِ انسان کے لئے مبارک تھی، اور وہ دور جس میں اس پر عمل ہوا، موجبِ ہزار خیر و برکت۔ بالفاظِ دیگر، اس رات میں فی ذاتہٖ کوئی ایسی خصوصیت نہیں تھی جس کی وجہ سے اس میں قرآن نازل ہوا۔ وہ خیر و برکت کی رات اس لئے کہلائی کہ اس میں یہ کتابِ مبارک انسانوں کو ملی۔

لہٰذا نحوست اور سعادت، دنوں۔ راتوں یا ساعتوں میں نہیں ہوتی۔ یہ اُس پروگرام (یا ضابطہ زندگی) میں ہوتی ہے جسے انسان اختیار کرتا ہے اور ان اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جو اس سے سرزد ہوتے ہیں۔

۲۔ **یتیم پوتے کی وراثت** | زبان کا خدا اپنی وضاحت آپ کرتا ہے۔ ملاحظہ فرما لیجئے۔
السلام علیکم۔ اخبارات میں آجکل یتیم پوتے کی وراثت کے بارے میں جو بحث چل رہی ہے

اس سلسلے میں آپ کو تاریخی دستاویز کے نقل بھیج رہا ہوں۔ امید ہے اب اس بحث کا خاتمہ ہو جائے گا۔

علوم اسلامی میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی مجتہدانہ حیثیت محتاج تعارف نہیں۔

میرے ایک دوست ڈاکٹر محمد یار خان سپر وائزر اسکول مڈ حیلز ایریا ڈیرہ غازی خان نے ۱۹۳۶ء میں اپنے نجی ضرورت کے تحت مولانا مرحوم سے استفسار کیا تھا جو جواب نقل ہے۔

اصل آج بھی جس وقت کوئی چاہے ڈاکٹر صاحب موصوف کے پاس ملاحظہ کر سکتا ہے۔ نقل ہذا برائے اشاعت ہے اور اس بارہ میں ہر قسم کی ذمہ داری میں اپنے اوپر لیتا ہوں۔ کیونکہ مدعا و مقصود ہدایت خلق ہے۔ والسلام

خواجہ محمد یوسف پیر سلیمانی۔ تونسہ شریف۔ ضلع ڈیرہ غازی خان۔

۲۸ ستمبر ۳۶ء

حبّی فی اللہ۔ خط پہنچا۔ اللہ تعالیٰ اس محبت و اخلاص کے لئے آپ کو جزائے خیر دے۔

فقہا نے پوتے کے محجوب الارث ہونے کی بنیاد اس امر پر رکھی ہے۔ کہ جب تک ایک شخص زندہ ہے وہ اپنی مقبوضات کا مالک ہے۔ اُس کی جائداد "ورثہ" جبھی ہوگی جب وہ انتقال کر جائے۔ زندگی میں ہبہ ہو سکتا ہے ارث نہیں ہے۔ اب اگر ایک لڑکا باپ کے مرنے سے پہلے مر گیا ہے؟ تو باپ کے ورثہ کا مالک ہی نہیں ہوا۔ کیونکہ باپ کی جائیداد نے ورثہ کی نوعیت اختیار ہی نہیں کی تھی۔ اور جب وہ خود ایک چیز کا مالک نہیں ہوا تو پھر اُس کی اولاد کیونکر ملک کا دعویٰ کر سکتی ہے؟

لیکن حق یہ ہے۔ کہ اُن کی نظر صرف ایک علت کی طرف گئی اور تمام علل و اصول جو اس باب میں ثابت و معلوم ہیں نظر انداز کر دیئے گئے۔ صحیح یہی ہے کہ محجوب کی اولاد کو بھی ورثہ ملنا چاہیئے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابوالکلام

(نوٹ) میں تصدیق کرتا ہوں کہ نقل مطابق اصل ہے جو مولانا مرحوم کے زرد ورق پر مولانا کا قلمی ہے۔ (محمد یوسف)

طلوع اسلام | ہم نے اس فتوے کو اس لئے نہیں شائع کیا کہ یہ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کی طرف سے ہے۔ بلکہ اس لئے کہ یہ قرآن کے مطابق ہے۔ یعنی ہمارے نزدیک دین میں سند نہ ہمارا نہ کسی اور انسان کا قول ہے۔ سند خدا کی کتاب ہے اور جو اس کے مطابق بات کہتا ہے اس کی بات سچی کہلا سکتی ہے۔

قرآن کی رو سے یتیم پوتا اپنے دادا کی وراثت سے محروم نہیں ہو سکتا۔ اس کے متعلق ہم بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور ایک پمفلٹ بھی شائع کر چکے ہیں۔

مولانا نے اپنے خط کے آخر میں لکھا ہے۔

صحیح یہی ہے کہ محجوب کی اولاد کو بھی ورثہ ملنا چاہیے۔

یہاں محجوب کی جگہ متوفی لکھنا چاہیے تھا۔ جو، بیٹا باپ کی زندگی میں وفات پا جائے اسے محجوب نہیں کہا جائے گا۔

عورتوں کے حقوق کیا ہیں

اور

اُن کے فرائض کیا؟

قرآن نے انھیں معاشرہ میں کونسا مقام عطا کیا ہے

ان تمام امور کے متعلق

طاہرہ کے نام خطوط

ہر دو جلدیں

دیکھئے

اس میں سلیس۔ سادہ اور دل کش انداز میں مختلف موضوعات کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس انداز کی دوسری کتاب آپ کو کہیں نہیں ملے گی — قیمت — جلد اوّل -/۲ روپے — جلد دوم ۲/۸

ملنے کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور

حقائق و عبر

تاریخ اور قرآن

محترم پرویز صاحب نے صدر زرعی اصلاحات کمیشن کو ایک کھلی چٹھی لکھی جسے اخبارات میں بھی شائع کر دیا گیا۔ (یہ چٹھی طلوع اسلام بابت دسمبر ۱۹۵۸ء میں بھی شائع ہو چکی ہے) اس چٹھی میں کہا یہ گیا تھا کہ قرآن کریم کی رُو سے زمین پر انفرادی ملکیت جائز نہیں۔ زمین رزق کا سرچشمہ ہے، جسے ملت کے نظام کی تحویل میں رہنا چاہیئے تاکہ وہ اس سے افرادِ مملکت کی پرورش کا انتظام کر سکے۔ اخبارات میں اس چٹھی پر بحث چھڑ گئی۔ (اور یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں) لیکن اس سلسلہ میں جتنی چٹھیاں اس وقت شائع ہوئی ہیں ان میں کسی ایک میں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ قرآن کی رُو سے پوزیشن یوں نہیں۔ یوں ہے۔ کہا گیا ہے تو یہ کہ تاریخ میں آیا ہے کہ فلاں صحابیؓ کے پاس اتنی زمین تھی اور انہوں نے فلاں قطعہ اراضی فلاں کے پاس فروخت کیا لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ اسلام میں زمین پر انفرادی ملکیت جائز ہے۔

اس سے ایک اہم سوال سامنے آتا ہے جس کا تعلق صرف زمین کی انفرادی ملکیت یا عدم ملکیت سے نہیں بلکہ وہ ایک اصولی سوال ہے جس کا دین کی اصل و بنیاد سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ قرآن کی رُو سے دولت جمع کرنا نہ صرف یہ کہ جائز نہیں بلکہ بہت بڑا جرم ہے۔ اس کی تائید میں وہ سورۂ توبہ کی یہ آیت پیش کرتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۹/۳۴)۔ جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں صرف کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ ان کے لئے ایک دردناک سزا کا اعلان کر دے۔ اس کے جواب میں دوسرا شخص کہتا ہے کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ فلاں فلاں صحابیؓ کے پاس دولت کے انبار جمع رہتے تھے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام میں دولت کا جمع کرنا جائز نہیں۔ اگر ایسا کرنا جائز نہ ہوتا تو وہ اتنی دولت کیسے جمع کر سکتے تھے؟

آپ نے سوچا کہ بات کیا ہوئی؟ یوں ہوئی کہ

(۱) بیشک قرآن میں یہی لکھا ہے کہ دولت جمع کرنا جائز نہیں۔ لیکن

(۲) چونکہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ صحابہ میں سے بعض کے پاس دولت کے انبار ہوتے تھے۔ اس لئے

(۳) یہ سمجھنا درست نہیں کہ اسلام میں دولت کا جمع کرنا جائز نہیں۔

اب اگر ان سے کہا جائے کہ پھر اس کا علاج کہ قرآن میں اس کے خلاف لکھا ہے تو وہ کہیں گے کہ یا تو قرآن کی اس آیت کو منسوخ ماننا پڑے گا یا اس کی ایسی تاویل کرنی ہوگی جس سے ثابت ہو جائے کہ اسلام میں دولت کا جمع کرنا جائز ہے۔

بالفاظ دیگر اس مسلک کی رُو سے دین میں معیار تاریخ ہے۔ قرآن نہیں۔ اگر کہیں تاریخ اور قرآن میں اختلاف ہوتا ہے، تو تاریخ کو محکم سمجھنا اور قرآن کو اس کے تابع رکھنا ہوگا۔

اب یہ دیکھئے کہ قرآن اور تاریخ کی حیثیت کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے اور اس پر ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم لفظاً لفظاً وہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ پر نازل کیا۔ اور وہی حق و باطل کا معیار ہے۔

اس کے برعکس تاریخ کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ عہد نبی اکرمؐ اور زمانہ صحابہ کے دو تین سو سال بعد انفرادی کوششوں سے مرتب ہوئی۔ ہماری سب سے پہلی جامع تاریخ طبری کی ہے جن کی وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اس سے پہلے کوئی ایسا تحریری ریکارڈ موجود نہیں تھا جس سے اسے مرتب کیا گیا ہو۔ پھر اس کے لفظاً لفظاً سچا ہونے کی تصدیق نہ خدا نے فرمائی نہ اس کے رسولؐ نے۔ نہ خلفائے راشدینؓ نے نہ دیگر صحابہؓ نے۔ اس میں صحیح اور غلط ہر قسم کا مواد موجود ہے۔

یہ ہے وہ تاریخ جسے یہ مقام عطا کر دیا جاتا ہے کہ جو کچھ اس میں لکھا ہے وہ دین میں سند ہے۔ اگر کبھی قرآن اور تاریخ میں تصادم ہو جائے تو تاریخ کا بیان سچا سمجھا جائے گا اور قرآن کو اس کے تابع رکھا جائے گا۔

آپ سوچئے کہ یہ مسلک کبھی حق و صداقت کا مسلک قرار پا سکتا ہے؟ حق و صداقت کا مسلک تو یہی ہو سکتا ہے کہ چونکہ قرآن کا لفظ لفظ صحیح اور سچا ہے اور دین میں وہی سند و معیار ہے اس لئے تاریخ کو اس کے تابع رکھنا چاہیئے۔

لیکن ہماری بدبختی ملاحظہ ہو کہ کوئی اس موقف کو صحیح اور مبنی بر صداقت ماننے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ ہر شخص یہی کہے گا کہ جو تاریخ میں آ گیا ہے وہی سند و معیار ہے۔ چونکہ ایسا ماننے والوں کے پاس کوئی علمی اور دینی دلیل ہوتی نہیں اس لئے وہ یہ کہہ کر لوگوں کے جذبات کو مشتعل کرتے رہتے ہیں کہ دیکھئے صاحب! یہ ایک نیا فتنہ اٹھا ہے۔ یہ شخص کہتا ہے کہ اسلام میں دولت کا جمع کرنا جائز نہیں (یعنی وہ یہ نہیں کہیں گے کہ قرآن کی فلاں آیت میں ایسا لکھا ہے۔ وہ یہی کہیں گے کہ یہ شخص ایسا کہتا ہے) حالانکہ فلاں صحابی کے پاس اتنے ہزار دینار تھے اور فلاں کے پاس اتنے لاکھ۔ اگر اس شخص کی بات صحیح تسلیم کر لی جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ صحابہ کبارؓ بھی قرآن کے خلاف عمل کرتے تھے!

اگر کوئی شخص ان کی توجہ قرآن کی آیت کی طرف مبذول کرائے تو اس کا فقط اتنا جواب دیدیا جاتا ہے کہ صحابہؓ کبار قرآن کو زیادہ سمجھتے تھے یا ہم زیادہ سمجھتے ہیں؟

آپ دیکھیں گے کہ اس ساری عمارت کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ جو کچھ تاریخ میں آیا ہے وہ محکم اور اٹل اور یکسر صحیح اور دین میں سند ہے۔ قرآن اگر اس کے مطابق ہے تو ہوا مراد۔ اگر اس سے اختلاف کرتا ہے تو قرآن کو اس کے مطابق کر لینا ہوگا۔ کیونکہ تاریخی بیان اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا۔

یہ مسلک (قرآن اور دین) کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہے۔ اسی کی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں نہ قرآن کی کوئی اہمیت باقی رہ گئی ہے نہ دین کو اس کی صحیح شکل میں دیکھنے کی کوئی ضرورت۔ دین کا جو نقشہ تاریخ کی رو سے مرتب ہوتا ہے وہی ہمارے ہاں اصل دین سمجھا جاتا ہے اور قرآن کا وہی مفہوم صحیح قرار پاتا ہے جو اس نقشہ کی تائید کرے جب تک اس عقیدے کو بدلا نہیں جاتا دین کا صحیح تصور ہمارے سامنے آ نہیں سکتا۔

قرآنی نقطۂ نگاہ سے تاریخ اور قرآن کے تصادم کا حل بڑا آسان ہے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) قرآن کریم کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ دین کے ہر معاملہ میں سند ہے اور اس کے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری خود خدا نے لے رکھی ہے۔ اس کے برعکس، تاریخ بہرحال انسانی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے پہلی بار مرتب ہونے میں بھی خدا کا ہاتھ نہیں تھا اور اس کے بعد اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خدا نے نہیں لی۔ جہاں تک عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہ کا تعلق ہے، اس میں یقیناً قرآن کا اتباع ہوتا تھا۔ لہٰذا اگر اس عہد سے متعلق تاریخ میں کوئی بات ایسی نظر آئے جو قرآن کے خلاف ہو تو ہمیں بلا تامل کہہ دینا چاہیئے کہ تاریخ کا وہ بیان غلط ہے۔ وہ حضرات کوئی قدم قرآن کے خلاف نہیں اٹھا سکتے تھے۔

باقی رہی ہمارے سلاطین کے زمانے کی تاریخ، سو اُن کے دور میں بہت کچھ قرآن کے خلاف ہوا (اور ہو رہا ہے)۔ خود ملوکیت جو تیرہ سو سال سے ہمارے معاشرہ کا جزو لازم بنے چلی آ رہی ہے، یکسر قرآن کے خلاف ہے۔ لہٰذا اس دور کی کوئی بات بھی ہمارے لئے دلیل اور حجت نہیں ہو سکتی۔ دلیل و حجت، دین کے معاملہ میں خدا کی کتاب ہے نہ کہ کسی بادشاہ کا قول و عمل انہوں نے جو کچھ قرآن کے خلاف کیا، وہ غیر اسلامی تھا۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں قرآن اور تاریخ کی صحیح پوزیشن۔ جب تک ہم اپنی تاریخ کو قرآن کی روشنی میں نہیں پرکھتے ماضی کا صحیح نقشہ ہمارے سامنے نہیں آ سکتا۔ اور جب تک ہم دین کے ہر معاملہ میں قرآن کو سند اور حجت نہیں مانتے، دین کا صحیح تصور قائم نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا جب بھی کوئی متنازعہ فیہ امر سامنے آئے (اور رو سے بھی دین کے ہر معاملہ میں) دیکھنا یہ چاہیئے کہ قرآن کریم کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے۔ نہ تاریخ کو قرآن پر قاضی بنانا چاہیئے اور نہ ہی یہ کہہ کر راہِ فرار اختیار کرنی چاہیئے کہ وہ حضرات ہم سے بہتر قرآن سمجھتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ہم سے بہتر سمجھتے تھے۔ لیکن اس کی کیا سند ہے کہ جو کچھ تاریخ میں ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ فی الواقعہ ایسا تھا۔ اگر جو کچھ ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ قرآن کے خلاف ہے تو ہمارے لئے یہ جائز نہیں کہ ہم قرآن کا وہی مفہوم لینے لگ جائیں جو ان کے عمل کے موافق لیکن خود قرآن کے خلاف ہو۔ ہمارے لئے

راہِ صواب یہ ہے کہ ہم کہہ دیں کہ تاریخ کا یہ بیان درست نہیں۔ یاد رکھئے قرآن اپنے سمجھانے میں تاریخ کا محتاج نہیں (تاریخ اپنی صداقت کے لئے قرآن کی محتاج ہے) اس لئے ہمیں قرآن کو خود قرآن سے سمجھنا چاہیئے اور تاریخ کو اس کی روشنی میں پرکھنا چاہیئے۔ یہی دین کی سیدھی راہ ہے۔

آتشِ نمرود

لاہور سے شائع ہونے والے ماہنامہ پیامِ مشرق، کی دسمبر ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا امتحان"۔ اس مضمون کے نیچے لکھا ہے "طبری۔ ابن اثیر"[1]۔ ہمارے سامنے اس وقت یہ کتابیں نہیں۔ لیکن حوالے سے یہی نظر آتا ہے کہ یہ مضمون وہیں سے لیا گیا ہے۔ بہرحال، آپ اس مضمون کو دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ ہمارے ہاں قرآن کو کس انداز سے سمجھایا جاتا ہے۔ مضمون یہ ہے:۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی۔ کہ اے ابراہیم تم ہمارے خلیل ہو۔ اور ہم تمہارے خلیل ہیں۔ اس بات سے پرہیز کرنا کہ میں تمہارے قلب کی طرف نظر ڈالوں تو وہاں کسی غیر کو نہ پاؤں۔ اگر ایسا کرو گے تو میری محبت اور دوستی ٹوٹ جائے گی اور میری نظر سے گر جاؤ گے حکم ہوا کہ میں ایسے شخص سے محبت کرتا ہوں کہ اگر میں اسے آگ میں ڈال کر جلا ڈالوں۔ تو بھی اس کے دل میں سوائے میرے کسی دوسرے کا خیال تک نہ آئے اور اسی طرح اس کا دل میری محبت میں مضبوط ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کر دکھایا یعنی جب آپ نے قتل انبیاء یعنی قوم نمرود کے بت خانہ میں تشریف لے جا کر سارے بتوں کو توڑا۔ اور قوم نمرود نے آپ کو گرفتار کیا۔ اور یہ تجویز پاس ہوئی کہ (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کو آگ میں جلایا جائے نمرود نے آتش خانہ تیار کر دیا۔ جس کا طول ایک میل اور عرض بھی ایک میل اور چار دیواری بیس گز بلند تھی اس آتشکدہ میں لکڑیاں جمع کرنی شروع کی گئیں۔ ہر شخص اس کام کو نہایت نیک کام سمجھتا تھا۔ بیمار منتیں مانتے کہ اگر تندرست ہو گئے تو اس احاطہ میں لکڑیاں ڈالیں گے۔ ماں کہتی۔ اگر میرے بچے کو آرام آگیا تو اتنی لکڑیاں ابراہیم کے جلانے کے احاطہ میں ڈالوں گی۔ غرضیکہ ہر قسم کے لوگ گھر گھر منتیں مان رہے تھے اور لکڑیاں احاطہ میں ڈلتے جاتے تھے۔ کچھ رعایا نے مدد دی اور باقی نمرود کی طرف سے ایک مہینے میں اس احاطہ کو پورا کیا گیا اور روغن وغیرہ ڈال کر آگ جلائی گئی۔ آگ اس زور سے بھڑکنے لگی۔ کہ اس آگ کے شعلے آسمان تک جانے لگے۔ کیا مجال تھی کہ کوئی پرندہ بھی احاطہ کے اوپر سے گذر جائے جب دور دور تک آگ کے شعلے بھڑکے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قید خانہ سے باہر لائے اور منجنیق کی صورت کی ڈھینگلی میں زنجیروں سے باندھ دیا۔ اور آگ کے احاطہ کی طرف لیجانے کا ارادہ کیا۔ تو

فَضَجَّتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَمَنْ فِیْهَا
مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ وَجَمِیْعُ الْخَلْقِ اِلَّا الثَّقَلَیْنِ ضَجَّةً
وَاحِدَۃً

---

[1] طبری ابن اثیر

ترجمہ: چیخ اٹھے آسمان اور زمین اور پہاڑ اور سارے فرشتے۔ دفعتہً اور عرض کیا

رَبَّنَا خَلِیْلُکَ یُلْقٰی فِی النَّارِ وَ لَیْسَ فِی الْاَرْضِ اَحَدٌ یَعْبُدُکَ غَیْرُہٗ

ترجمہ: اے اللہ جناب کا دوست اور خلیل آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ اگر آج یہ جل گیا۔ تو پھر تیری عبادت زمین پر کون کرے گا۔ اے اللہ ہمیں ان کی مدد کرنے کی اجازت دے۔ ارشاد ہوا۔

ھُوَ خَلِیْلِیْ لَیْسَ لِیْ خَلِیْلٌ غَیْرُہٗ وَ اَنَا اِلٰہُہٗ لَیْسَ لَہٗ اِلٰہٌ غَیْرِیْ فَاِنِ اسْتَغَاثَ بِکُمْ فَاَغِیْثُوْہُ وَ اِنْ لَمْ یَدْعُ غَیْرِیْ فَخَلُّوْا بَیْنِیْ وَ بَیْنَ خَلِیْلِیْ

ترجمہ: ابراہیم ہمارا پیارا دوست ہے اس کے سوا ہمارا ساری زمین پر کوئی دوست نہیں اور ہم اس کے معبود ہیں۔ ہمارے سوا اس کا کوئی معبود نہیں۔ تم جاؤ اگر وہ تم سے مدد طلب کرے تو اس کو مدد دو۔ اور اگر وہ تم سے رخ بھی نہ ملائیں تو خلیل جانے یا خلیل کا پروردگار؟

یہ حکم سنتے ہی بہت سے ملائک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئے۔ سب سے پہلے پانی کے موکل فرشتہ نے حاضر ہو کر عرض کیا۔ کہ اے اللہ کے خلیل آپ کے ایک اشارہ کا منتظر ہوں۔ اگر آپ اشارہ کریں۔ تو ابھی اس آگ پر مینہ برسا دوں اور فوراً آگ ٹھنڈی ہو جائے گی۔ اللہ تعالےٰ نے پانی کے خزانے میرے ہاتھ میں دے کر بھیجا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس فرشتہ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اور فرمایا۔

اَمَّا اِلَیْکَ فَلَا۔ ترجمہ تیری مجھے کچھ حاجت نہیں

اس کے بعد ہوا کے موکل نے حاضر ہو کر عرض کیا۔ کہ یا حضرت ایک اشارہ کا منتظر ہوں۔ اگر آپ کا اشارہ ہو تو فوراً اس آگ کو اڑا دوں۔ آپ نے اس کی طرف سے بھی منہ پھیر کر فرمایا

لَا حَاجَۃَ اِلَیْکُمْ۔ ترجمہ تمہاری ضرورت نہیں

اس کے بعد حضرت جبریل امینؑ تشریف لائے اور حضرت سے دریافت کیا کہ کچھ حاجت ہے اگر اشارہ ہو تو اس آگ کو پارہ پارہ کر اڑا دوں فرمایا۔

اَمَّا اِلَیْکَ فَلَا۔ ترجمہ مجھے تمہاری کچھ حاجت نہیں

حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا کہ اگر غیر سے نہیں تو اس پروردگار عالم سے مدد طلب کرو۔ فرمایا اے جبریلؑ وہ تو سب کچھ جانتا ہے۔ بس میرے لئے یہ کافی ہے کیونکہ اگر میں اللہ تبارک تعالیٰ سے مدد طلب کروں تو کیسے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ پاک اور میری زبان ناپاک ہے۔ اگر دل سے مدد مانگوں۔ تو میرا دل اس کا عاشق ہے وہ کب خلاف مرضی عرض کر سکتا ہے۔

یَا جِبْرِیْلُ مَنْ اَوْقَدَ النَّارَ قَالَ اَوْقَدَھَا النَّمْرُوْدُ قَالَ

مَنْ حَکَمَ بِیْ اِلَیْکَ قَالَ الْجَلِیْلُ۔

(ترجمہ) اے جبریل یہ آگ کس نے جلائی۔ کہا نمرود نے اچھا نمرود کو کس نے حکم دیا۔ فرمایا رب جلیل نے۔

اَلْخَلِیْلُ رَاضٍ بِحُکْمِ رَبِّ جَلِیْلٍ۔ ترجمہ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا اے جبریل خلیل راضی ہے۔ رب جلیل کے حکم سے۔ تم ہٹ جاؤ ہمیں جلنے دو۔ دیکھو آگ خلیلؑ کو جلاتی ہے۔ یا خلیل اس آگ کو عشق الٰہی کی آگ میں جلاتا ہے۔

عشق آتشیست کہ آتش دوزخ غذائے اوست

حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا کہ آج آپ کے عشق کے حالات اور کیفیت لکھوں گا۔ فرمایا لکھو گے کس چیز پہ۔ اگر کاغذ پر لکھو گے تو وہ جل جائے گا۔ اگر لوہے پر لکھو گے تو وہ پگھل جائے گا۔ یہ داستان تو خلیل کے دل کے اوپر لکھی جا سکتی ہے۔

اے جبریل ہٹ جاؤ فراق میں جان نکل رہی ہے۔ آج رب جلیل نے اپنے بندہ خلیل سے آگ کے اندر دیدار دکھلانے کا وعدہ کیا ہے۔ سب کو ہٹا دیا اور آپ تنہا نمرود کی آگ میں ڈالے گئے۔ جب آگ میں پہنچ گئے..... تو رب جلیل نے آگ کو پکارا

یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ ترجمہ اے آگ سرد ہو جا! دیکھ اگر ابراہیم کی زنجیروں کے سوا تو نے ایک رونگٹا بھی جلایا تو ایسے عذاب میں ڈالوں گا کہ جس کا کوئی شمار نہ ہو گا۔

آگ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آہنی زنجیریں جلا ڈالیں اور اسی وقت ٹھنڈی ہو گئی۔ آدھی جلی ہوئی لکڑیاں، گلاب چنبیلی کے درخت بنے آب شیریں کی نہریں جاری ہو گئیں چالیس دن تک آپ اس آگ میں رہے اور آپ کو وہ سرور و راحت میسر آیا کہ وہاں سے نکلنے کے بعد کبھی اس کا عشر عشیر بھی نصیب نہ ہوا۔ جب آگ ٹھنڈی ہو چکی تو حضرت جبریل علیہ السلام جنت سے ایک حُلّہ اور خدا کا سلام لائے اور ساتھ ہی یہ پیغام بھی لائے کہ اسے ابراہیم تم نے دیکھ لیا کہ ہمارے پیاروں کو آگ نہیں جلا سکتی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کلام پاک میں بھی فرمایا ہے کہ جہنم کی آگ دشمنوں کے لئے ہے۔ خدا کے دوستوں کے لئے نہیں بلکہ وہی آگ خدا کے دوستوں کے لئے گلزار ہو گی۔ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ

شفاعت صغریٰ کے وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سارے انبیاء اولیاء شہداء و صلحا کو ساتھ لے کر دوزخی لوگوں کو نکالنے کے لئے دندانہ جہنم کے اندر تشریف لیجائیں گے۔ مگر وہ دوزخ بھی آپ کے لئے چمن ہو گا۔

فائدہ: بالآخر سب کو دریائے فنا میں غرق ہونا ہے اگر باقی رہنا چاہتے ہو تو اس باقی کی محبت میں فنا ہو جاؤ۔ جس طرح انبیاء اور اولیا اس کی محبت میں فنا ہوئے۔

ملوکیت

بیچارے شاہنشاہ ایران، ایک عدد ولی عہد کی تلاش میں جس طرح مارے مارے پھر رہے ہیں، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے (الاعتصام، لاہور) اپنی ۱۲ دسمبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں رقمطراز ہے۔

اس کا یہ پہلو کس قدر دردناک ہے کہ ابھی تک اس دنیا میں کچھ اس قسم کے برخود غلط لوگ بھی موجود ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ کچھ افراد یا خاندان پیدائشی طور پر ہی شاہ پیدا ہوتے ہیں اس لئے دنیا کو ضرور ان کی تلاش یا انتظار کرنا چاہیئے۔ شاید انھیں معلوم نہیں کہ اب ملوکیت کا زمانہ نہیں رہا۔ دیر تو ہو سکتی ہے مگر لفت دیر ممکن نہیں تھی۔

یہ تبصرہ بالکل بجا اور درست ہے۔ ملوکیت (یعنی حکومت کا باپ سے بیٹے کی طرف، پیدائشی طور پر، منتقل ہونا) اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے اور دنیا رفتہ رفتہ اس عظیم حقیقت کے قریب آتی جا رہی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے ہاں یزید سے لیکر اس وقت تک جتنے بادشاہ گذرے ہیں (انھیں رکھیئے ان کے جنھوں نے سلطنت اپنی قوتِ بازو سے حاصل کی تھی) حکومت ہی طرح ورثے میں ملی تھی۔ ان کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ اور ان کے ساتھ اُن بزرگانِ کرام کے متعلق کیا جو ان کے حق میں، منبروں سے خطبوں میں، ایدہ اللہ بنصرہ اور خلد اللہ ملکہ کی دعائیں مانگتے تھے؟ یہ دعائیں آج بھی اسی طرح مانگی جاتی ہیں۔ چنانچہ جریدہ صدق جدید (لکھنؤ) کی ۱۹ر دسمبر کی اشاعت میں، "ایک مجاہد فرمانروا۔ سلطانِ اسلام، والیٔ نجد و حجاز" کی ایک تقریر کا اردو ترجمہ شائع ہوا ہے۔ جس میں ان کے لئے "خلد اللہ ملکہ" کی دعاؤں کے ساتھ یہ تہنیت بھی موجود ہے کہ

الحمد للہ! اس دنیا کے پردے پر اب بھی کم سے کم ایک فرمانروا تو ایسا موجود ہے جو اپنی اور اپنے قانون کی اسلامیت کا یوں اعلان عام شرم اور جھجک کے بغیر کر رہا ہے۔

آپ بھی رو دیجئے

مسلک اہلِ حدیث کے داعی: جریدہ الاعتصام (لاہور) کی ۱۲ر دسمبر کی اشاعت میں (صفحہ اول پر حسب ذیل مضمون "اسلامی معاشرہ" کے موضوع پر "تلاوتِ قرآن میں رونا اور خوفِ الٰہی" کے زیرِ عنوان شائع ہوا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت عاصم احول فرماتے ہیں، حضرت صفوان بن محرز جب آیت وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ (۲۲۷۔ شعراء) اور عنقریب جان لیں گے ظلم کرنے والے کہ کیسی جگہ لوٹ کر جائیں گے، پڑھتے تو رو پڑتے اور اس قدر روتے کہ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے آپ کا سینہ ٹوٹ گیا ہے۔

گرتے پڑتے رات کٹ گئی

حضرت عمرو بن عتبہ حضرمی نوافل مسجد کے بجائے گھر میں آ کر پڑھا کرتے تھے ایک دن معمول کے مطابق عشاء کی نماز پڑھ کر گھر تشریف لائے اور آ کر نوافل شروع کر دیئے۔ جب آپ پڑھتے پڑھتے آیت "وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْآزِفَةِ" پڑھی۔ پڑھ کر روئے اور غش کھا کر گر پڑے۔ بس اسی طرح ساری رات کٹ گئی۔ نہ رکوع کرنے کی نوبت آئی اور نہ نماز آپ سے مکمل ہو سکی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

ایسے گرے کہ پھر نہ اٹھے

حضرت زرارۃ بن اوفی ایک جامع مسجد میں امام اور خطیب تھے۔ ایک دن نماز پڑھاتے ہوئے آیت فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ۝ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ۝ عَلَى الْكَافِرِينَ

عَسِیْرٌ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ غَیْرُ یَسِیْرٍ ○ (پ ۲۹ مدثر) (پھر جب قیامت میں صور پھونکا جائے گا تو وہ دن اس وقت کٹھن دن ہوگا۔ کافروں کے لئے مشکل تر ہوگا) پڑھی تو بے ہوش ہو کر ایسے گرے کہ پھر نہ اٹھے۔ اللھم ارحمہ۔

جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

حضرت شُلیہ نے نماز پڑھی۔ جب آیت کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ پہ پہنچے تو عالم مستی میں اس کو بار بار پڑھتے رہے۔ اس میں اس قدر سوز و گداز کی بجلیاں بھری تھیں کہ مکان کے ایک گوشہ سے آواز آئی

اس آیت کی تکرار کو کب تک جاری رکھو گے؟ آپ نے تو چار جنوں کی زندگیاں پھونک ڈالیں۔ آپ کی اس دل گداز تکرار کی وجہ سے ان کو اوپر کی طرف سر اٹھانے کی ہمت ہی نہیں ملی۔ وہیں ڈھیر ہو کر رہ گئے ہیں۔

یہ سن کر حضرت شلیہ پر ایسی وحشت اور سرگشتگی طاری ہوئی کہ ان کا حلیہ ہی بدل گیا اپنے اہل و عیال کے لئے ان کو پہچاننا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

تڑپا اور جاں بحق ہو گیا

ایک قاری نے یہ آیت پڑھی۔ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ مَوْلٰىھُمُ الْحَقِّ پ ۱۱ یونس ع ۳ (سب اللہ کی طرف لوٹائے جائیں گے جو ان کا حقیقی مالک ہے) تو اس کی آواز ایک اہل دل بندہ کے کانوں میں پڑ گئی۔ سنتے ہی ایک چیخ نکلی۔ تھوڑی دیر تک نیم بسمل کی طرح تڑپے اور جاں بحق ہو گئے۔

کلیجہ پھٹ گیا

ایک صاحب نے کسی قاری کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا۔ قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَ اَھْلِیْکُمْ نَارًا وَّقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ (پ ۲۸ تحریم ع ۱) (اپنے آپ کو اور اپنے کنبہ کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں) تو جاں بحق ہو گیا۔ کیونکہ خوف الٰہی سے اس کا کلیجہ پھٹ گیا تھا۔

مسجد کی آغوش میں موت

حضرت فضیل بن عیاض سے پوچھا گیا کہ آپ کے صاحبزادے کا انتقال کس سبب سے ہوا؟ تو آپ نے فرمایا رات کو مسجد میں قرآن کی تلاوت کرتا رہا۔ جب صبح ہوئی تو اس کی محراب کی آغوش میں مردہ پایا گیا۔

حضرت تمیم داری کا بکاء

حضرت تمیم داری اپنی قیام گاہ میں تشریف لائے اور سورہ جاثیہ پڑھنا شروع کی۔ جب آپ آیت اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَھُمْ کَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاھُمْ وَ مَمَاتُھُمْ سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ پ ۲۵ جاثیہ ع ۱ (کیا وہ لوگ جو جرائم کے مرتکب ہوئے یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان جیسا بنا دیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے کہ ان کا جینا اور مرنا ایک سا ہوگا؟ یہ کس قدر برا فیصلہ کرتے ہیں) پر پہنچے تو صبح تک اس کو بار بار پڑھتے اور روتے رہے۔

رو رو کر آنکھیں گنوا دیں

ایک رات حضرت سعید بن جبیرؓ نماز تہجد کیلئے اٹھے۔ پھر نماز میں یہ آیت پڑھی وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْہِ اِلَی اللّٰہِ پ ۳ بقرہ ع ۳۸ (اس دن سے ڈرو جب تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے) اس آیت کا آپ پر اتنا اثر ہوا کہ آپ اس کو بار بار پڑھتے اور روتے رہے یہاں تک آپ کی آنکھوں کی بینائی حد درجہ کمزور ہو گئی۔

رابطۂ باہمی

منٹگمری - ملتان

بزمِ طلوعِ اسلام (منٹگمری) کی دعوت پر پرویز صاحب مع چند رفقاء، ۲۹ر نومبر (اتوار) کی شام منٹگمری پہنچے۔ اور سوموار دوپہر سے پہلے وہاں کی روٹری کلب سے خطاب کیا۔ موضوعِ گفتگو تھا "وحی اور عقل کا باہمی تعلق"۔ وہاں کی روٹری کلب ایک مختصر سی جماعت ہے لیکن نہایت شائستہ اور سنجیدہ۔ اس لئے علمی موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے ایک اچھا مرکز۔ یہ مختصر سی نشست عمدہ نتائج کی حامل رہی۔

یکم دسمبر (پیر) کی دوپہر کو، گورنمنٹ کالج کے طلباء سے خطاب تھا۔ منٹگمری کا گورنمنٹ کالج، اپنی پُرشکوہ عمارت۔ بہار آفریں ماحول، طلباء کی کثرت، ان کے حسنِ تربیت اور ڈسپلن۔ اساتذہ کی بالغ نظری اور فرائض شناسی کے اعتبار سے ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ کالج کے وسیع ہال میں (جہاں ہزار سے اوپر طلباء کا اجتماع تھا) تقریر کا انتظام کیا گیا تھا۔ موضوعِ تقریر تھا "قرآن اور علومِ فطرت"۔ طلباء نے تقریر کو اس توجہ اور انہماک سے سنا کہ اس دوران میں کسی کے کھانسنے تک کی آواز نہیں آئی۔ یہ امر بجائے خویش اس حقیقت پر دال تھا کہ طلباء کے دل و دماغ کی تربیت عمدہ خطوط پر کی جا رہی ہے۔ یہ اجتماع بڑا کامیاب تھا۔ ہم اس حسنِ انتظام کے لئے کالج کے پرنسپل، محترم میاں اصغر علی صاحب۔ اور پیر دیئیر شبنم دل صاحب کے بالخصوص شکر گذار ہیں۔

سہ پہر کو: کورٹ کے احاطہ میں: وکلا صاحبان کی ایک غیر رسمی نشست میں مختلف موضوعات پر استفسارات و جوابات کا سلسلہ رہا۔ چونکہ آج کل زرعی اصلاحات کا چرچہ زیادہ ہو رہا ہے، اس لئے زیادہ تر سوالات اس موضوع سے متعلق تھے۔

رات کو مجلس فکر و ادب کے زیرِ اہتمام: لائبریری ہال میں جلسۂ عام تھا۔ موضوعِ تقریر تھا، "قرآن کا نظامِ ربوبیت"۔ محترم اویس صاحب، ڈپٹی کمشنر، صدرِ جلسہ تھے۔ دو سال قبل، اسی ہال میں، اسی مجلس کے زیرِ اہتمام، "مقامِ محمدی" کے عنوان سے پرویز صاحب کی تقریر ہوئی تھی۔ اس بار مجمع کا سکوت و انہماک ویسا ہی تھا۔ لیکن سامعین کی تعداد زیادہ تھی۔ اجتماع بڑا کامیاب رہا۔ اس کے حسنِ انتظام کے لئے محترم ظفر علی خاں صاحب، سکریٹری ڈسٹرکٹ بورڈ خاص طور پر شکریہ کے مستحق ہیں۔

منٹگمری کا یہ دو روزہ پروگرام قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے دور رس نتائج کا حامل تھا۔ اس سلسلہ میں محترم چوہدری عطاء اللہ صاحب۔ ڈاکٹر عبدالقادر خان صاحب۔ اور شیخ ظفر علی خان صاحب نے جس خلوص و محبت سے تمام انتظامات کئے ان کا گہرا اثر ہمارے قلوب پر ہے۔

۹ر دسمبر (منگل) کی صبح منٹگمری سے ملتان کی طرف روانگی (بذریعہ موٹر ہوئی) ملتان سے ذرا ادھر سڑک پر ایک بورڈ دیکھا جس پر پنج کسی لکھا تھا۔ اس نام نے فوراً قدم روک لئے اور قرآنی کارواں کا رُخ اس سمت کی طرف ہو لیا۔

پنج کسی ایک گاؤں ہے جس میں چند نہایت مخلص قرآنی احباب نے بزم قائم کر رکھی ہے۔ ملتان کے علاقے میں یہ واحد بزم ہے اس لئے اس کی اہمیت واضح ہے۔ گاؤں میں سب سے پہلے محترم عطا محمد صاحب ملے اور دیکھتے ہی دیکھتے بزم کے قریب قریب تمام احباب جمع ہو گئے۔ پرویز صاحب اور دیگر احباب کے وہاں اس طرح غیر متوقع اور اچانک پہنچ جانے سے وہاں کے احباب کے دل کی کیفیات ان کے شگفتہ چہروں۔ شاداب پیشانیوں اور درخشندہ آنکھوں سے اچھلی پڑ رہی تھیں۔ اس قسم کی ملاقاتوں سے یہ حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ قرآن کا رشتہ کس قدر گہرا اور بے لوث رشتہ ہوتا ہے۔

رات کو مسلم ہائی اسکول، ملتان کے ہال میں، ملتان اکادمی کے زیر اہتمام، اور محترم عطا محمد خان صاحب نشاری (کمشنر ملتان ڈویژن) کے زیر صدارت، اجتماع تھا۔ چونکہ اکادمی، ایک علمی مجلس ہے، اس لئے تقریر کا عنوان تھا "قرآن کی رُو سے علم کا تصور" ملتان میں پرویز صاحب کی تقریر کا یہ پہلا موقع تھا۔ سردی کا موسم، رات کا وقت۔ موضوع بھی (بظاہر) خشک سا۔ لیکن اس کے باوجود مجمع کافی تھا (حالانکہ جلسہ عام نہیں تھا۔ صرف مدعوئین پر مشتمل تھا)۔ تقریر نہایت جذب و انہماک سے سنی گئی تقریر کے بعد سوالات کی باری آئی تو سامعین نے صاحب صدر سے اجازت حاصل کر لی کہ ان کے استفسارات، موضوع تقریر کے علاوہ دیگر عنوانات سے متعلق بھی ہو سکتے ہیں۔ اس سے اجتماع کی افادی حیثیت اور بھی بڑھ گئی۔ چنانچہ سوالات، قرآن کے معاشی نظام سے لے کر کمیونزم اور دستور پاکستان سے لے کر حدیث کی دینی حیثیت تک کے مختلف گوشوں سے متعلق تھے۔ پرویز صاحب نے جب کمیونزم اور اسلام کے فلسفۂ زندگی (آئیڈیالوجی) کا مقابلہ کرنے کے بعد، پورے اعتماد سے اعلان کیا کہ "نہ کوئی مسلمان کبھی کمیونسٹ ہو سکتا ہے اور نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان"، تو فضا میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ پھر جب انھوں نے حدیث کے متعلق اپنا مسلک بیان کیا تو سامعین کی طرف سے اس کا بڑی گرمجوشی سے استقبال ہوا اور مختلف گوشوں سے بے ساختہ اس قسم کی آوازیں آئیں کہ ہمیں تو اس باب میں کچھ اور ہی بتایا گیا تھا۔

ملتان کا یہ پہلا اجتماع، قرآنی فکر کی اشاعت کے لئے، تخم صالح کی حیثیت رکھتا ہے جس کے لئے ہم ملتان اکادمی کے ارباب ہمت و کشاد کے لئے خصوصیت سے شکر گذار ہیں۔

۱۰ر دسمبر کی سہ پہر، ہمارے مہربان خصوصی محترم نذیر احمد خان صاحب (پلیڈر) کے ہاں، ملتان کے ارباب علم و بصیرت کا ایک غیر رسمی اجتماع تھا۔ تجربہ نے بتایا ہے کہ اس قسم کے غیر رسمی اجتماعات، بعض اعتبارات سے، رسمی جلسوں سے کہیں زیادہ

نتیجہ خیز ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس اجتماع کی بھی یہی کیفیت رہی۔

رات کو اسی ہال میں، لیکن بزم اقبال کے زیر اہتمام، دوسرا اجتماع ہوا۔ صدر پھر محترم بخاری صاحب تھے۔ موضوع تھا۔ من و یزداں، فکر اقبال کی روشنی میں ـــ قرآن کی راہ نمائی۔ اقبال کی فکر۔ من و یزداں کا عنوان اور پرویز صاحب کی زبان۔ ڈیڑھ گھنٹے تک یوں محسوس ہوتا رہا گویا فضا میں نور و نکہت کی بارش ہو رہی ہے۔ رات کافی گذر گئی تھی۔ اور کھانا بھی انتظار کر رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کسی کا اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جلسہ میں ملتان میں بزم طلوع اسلام کی تشکیل کا بھی اعلان ہوا۔ یہ دوسرا اجتماع، فکر آزاد ذہن کے نہایت درخشندہ نقوش دلوں پر چھوڑ کر اختتام پذیر ہوا۔ اس کے لئے ادارہ طلوع اسلام انجمن اقبال کے عہدہ داران حضرات کا بالعموم اور بزم کے سکریٹری صاحب کا بالخصوص سپاس گذار ہے۔

جلسے کے بعد کھانے پر بڑی دل چسپ اور مفید گفتگو رہی جس میں بخاری صاحب کے علاوہ ملتان کے ڈپٹی کمشنر محترم مسعود صاحب نے خاص طور پر حصہ لیا۔ بخاری صاحب تو طلوع اسلام کی قرآنی فکر سے بہت عرصہ سے واقف تھے۔ مسعود صاحب سے البتہ پہلی دفعہ ملاقات ہوئی۔ ان کے سوالات کی نوعیت۔ انہماک و تفہیم کا انداز۔ غور و فکر میں سنجیدگی اور نگاہ میں وسعت اس حقیقت کی آئینہ دار تھی کہ ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں دل و دماغ کی صلاحیتوں کی کمی نہیں۔ یہ محفل بھی دیر تک جمی رہی۔

ملتان کا یہ پہلا سفر ہر اعتبار سے کامیاب رہا۔ اس کے لئے ہم، علاوہ دیگر احباب۔ محترم نذیر احمد خان صاحب پلیڈر اور شیخ عبدالباری صاحب (سگنل انجینئر ریلوے) کے بصمیم قلب شکر گذار ہیں جن کی مہمان نوازی اور حسن انتظام نے ہمارے اس دورے کو اس طرح کامیاب بنایا۔

اس قسم کے دوروں سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ فضا قرآنی فکر کے لئے بڑی سازگار، اور حساس قلوب اس کے حصول کے لئے مضطرب و بے قرار ہیں۔ کمی اپنی کی طرف سے ہے جنہوں نے اس فکر کو دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے رکھی ہے۔

ماہانہ رپورٹوں کا ملخص

پشاور ذاتی رابطہ پیدا کرنے کے لئے متعدد احباب سے مل کر قرآنی فکر پر گفتگو کی گئی۔

پنڈ دادن خان (جہلم) بزم کے ارکان میں اضافہ ہوا۔ کتابیں مطالعہ کے لئے دی گئیں۔ پڑھنے والوں نے مزید کتب کا مطالبہ کیا ہے۔ شہر سرگودھا میں قیام بزم کی کوشش جاری ہے۔

پنج کسی (ملتان) کتب اور پمفلٹ مطالعہ کے لئے دیئے گئے۔ لمعات۔ نومبر ۱۹۷۰ء تقسیم کئے اور ان پر مبنی عریضہ صدر پاکستان کو بھیجا گیا۔

۸ر دسمبر کو محترم پرویز صاحب اور رفقاء نے اچانک پہنچ کر اراکان بزم سے ملاقات کی۔ چیدہ مقامی احباب وہ تقریر سنتے گئے جو محترم پرویز صاحب نے ۸ر دسمبر کو ملتان میں کی تھی۔ احباب ملتان کو "اصولی ہدایات" کی کاپیاں پہنچائی گئیں۔

ٹنڈو محمد خان (حیدرآباد) سیاسی تبدیلیوں نے بعض احباب میں جو ذہنی الجھاؤ پیدا کر دیا تھا۔ وہ اب دور ہو گیا ہے اور نشر و اشاعت کا کام جوش و خروش سے جاری ہے۔

جھنگ قابل ذکر کچھ نہیں۔

چک نمبر ۱۰ شمالی (سرگودھا) شہر سرگودھا میں تشکیل بزم کے لئے کوشش کی گئی۔ شہر بھلوال میں متعدد احباب کو کتابیں مطالعہ کے لئے دی گئی تھیں، کتابوں سے متاثر ہو کر انھوں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ محترم پرویز صاحب کو دعوت دی جائے۔ ہر دو شہروں میں "لمعات" نومبر ۱۹۷۹ء کی کاپیاں تقسیم کی گئیں۔ مقامی بزم کے اراکان نے "مقام حدیث" جلد دوم کا مطالعہ کیا۔ لمعات پر مبنی عرضداشت صدر پاکستان کو بھیجنے پر غور کیا گیا۔

چک ۲۲۸ (جھنگ) بزم کے جلسہ میں قریبی گاؤں کے احباب کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ دسمبر ۱۹۷۹ء کے طلوع اسلام میں سے دو مضمون پڑھے گئے۔ نئے احباب کو طلوع اسلام کے مقصد اور مسلک سے آگاہ کیا گیا۔ اور کتابیں مطالعہ کے لئے دی گئیں اور پمفلٹ "قرآنی معاشرہ" تقسیم کیا گیا۔

چنیوٹ (جھنگ) سال آئندہ کے لئے انتظامی معاملات زیر غور رہے یعنی نمائندہ کا انتخاب۔ ماہانہ چندہ کا تعین۔ طلوع اسلام کی مقامی طور پر بلا معاوضہ تقسیم۔ نیز محترم پرویز صاحب کے متوقع دورہ کی تفصیلات مرتب کی گئیں۔

راولپنڈی مقامی خریداران طلوع اسلام سے رابطہ قائم کیا گیا تاکہ وہ بزم میں شرکت کریں۔ گوجر خاں کے خریداران سے خط و کتابت کی کہ وہ اپنے ہاں بزم قائم کریں۔ مری کے ایسے احباب کو جو قرآنی فکر سے دلچسپی رکھتے ہیں طلوع اسلام بلا قیمت بھیجا جایا کرے گا۔ "لمعات" نومبر ۱۹۷۹ء کی کاپیاں اہل الرائے اصحاب میں تقسیم کی گئیں۔

سیالکوٹ شہر ہفتہ وار درس قرآن جاری رہا۔ "لمعات" نومبر ۱۹۷۹ء کی تقسیم کی گئی۔ رد عمل معلوم کیا جا رہا ہے۔

سید حسین (جہلم) پمفلٹ "رحمۃ للعالمین" تقسیم کیا گیا۔ مختلف کتب پڑھنے کے لئے عوام کو دی گئیں۔ فیصلہ کیا کہ نصف آمدنی دارالمطالعہ کے قیام کے لئے محفوظ رکھی جائے۔ اور کنونشن کیمپ کو برتنوں وغیرہ کے لئے دس روپے بھیجے جائیں۔

قصور (لاہور) پمفلٹ تقسیم کئے اور کتابیں پڑھنے کے لئے دی گئیں۔

کراچی ہفتہ وار اجتماعات باقاعدگی سے ہوئے۔ چنتالیس لائبریریوں کو طلوع اسلام بھجوایا گیا۔ کوئی پچاس

اصحاب کو دارالمطالعوں سے پڑھنے کے لئے کتابیں دیں۔ بزم کے ایک رکن کی مالی مشکلات دور کیں اور دوسرے رکن کو کسی تنازعہ کی پریشانی سے آزاد کرایا۔ ادارہ کی مطبوعات کی کراچی میں فراہمی اور ٹیپ ریکارڈر کی خرید کے لئے کوشش ہو رہی ہے۔ بزم کے چار دارالمطالعوں میں سے تین تجربی کام کر رہے ہیں اور جو معطل کر دیا گیا ہے۔ شیر شاہ کالونی کا دارالمطالعہ زیادہ کامیاب رہا ہے۔

مردان درس قرآن یا کتب ادارہ کا مطالعہ روزانہ ایک گھنٹہ کے لئے ہوتا رہا۔ ستمبر ۵۸ء کے طلوعِ اسلام کا مضمون "جہانِ نو" کا ترجمہ پشتو میں مقامی تقسیم کے لئے کیا گیا۔ مری کے ایک صاحب کے نام طلوعِ اسلام ایک سال کے لئے جاری کرایا گیا۔ ایک اور صاحب ذوق کو کتابیں مطالعہ کے لئے عاریتاً دی گئیں۔ "لمعات" نومبر ۵۸ء انداز اً پچاس اصحاب تک پہنچائے گئے۔ جن کا ردِ عمل حسبِ دلخواہ تھا۔ فیصلہ کیا گیا کہ بزم اپنا ٹیپ ریکارڈر خریدے۔

ہنگو (کوہاٹ) ہفتہ وار اجتماعات ہوئے۔ پمفلٹ تقسیم کئے گئے۔ طلوعِ اسلام کا لٹریچر پڑھنے میں لوگ زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔

درج ذیل بزموں نے رپورٹ نہیں بھیجی

پشاور صدر۔ جام پور۔ جہلم۔ ڈیرہ غازی خاں۔ سیالکوٹ (چھاؤنی)۔ چیچہ وطنی۔ جھنگ مگھیانہ (؟)۔ چونڈہ۔ شیخوپورہ۔ کلری (جھنگ)۔ لاہور۔ لائلپور۔ راحمد آباد۔ چمن بوٹہ۔ چارباغ۔ نوانکلی)۔

دورہ کے اخراجات بزموں کی دعوت پر محترم پرویز صاحب مختلف مقامات میں تشریف لے جاتے ہیں جہاں طے شدہ پروگرام کے مطابق کارروائی عمل میں آتی ہے۔ جہاں تک لاہور سے آمد و رفت کے اخراجات کا تعلق ہے وہ محترم موصوف خود برداشت کرتے ہیں۔ لیکن ان کے اور ان کے رفقاء کے قیام و طعام کا بندوبست بزموں کی طرف سے ہوتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بزمیں کھانے کے معاملہ میں تکلف کرتی ہیں۔ آئندہ دوروں کے موقع پر اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کھانا سادہ ہو اور اخراجات میں اسراف سے بچا جائے۔ اگر مقامی حالات کے پیشِ نظر کسی دعوت وغیرہ کا انتظام ضروری سمجھا جائے تو اس میں بھی سادگی ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیئے۔

پرویز صاحب کا درسِ قرآن ٹیپ پر متعدد بزموں کا تقاضا ہے کہ محترم پرویز صاحب کے ہفتہ واری درسِ قرآن کے ٹیپ انہیں بھیجے جائیں تاکہ وہ مقامی آبادی کو سنا سکیں۔ تجویز مفید ہے لیکن اس کی عملی شکل کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

(۱) تقریر کا ٹیپ سنانے کے لئے "ٹیپ ریکارڈر" کا ہونا لازمی ہے جو بزم خریدے گی یا عاریتاً حاصل کرے گی۔

(۲) متعلقہ بزم سادہ ٹیپ لاہور بھیجے گی۔ وہاں اس پر تقریر ریکارڈ ہوگی اور بھرا ہوا ٹیپ بزم کو واپس کر دیا جائے گا۔ جو اسے اپنے ریکارڈر پر چڑھا کر سنا سکے گی۔

(۳) ٹیپ قیمتی چیز ہے اس لئے ہر بزم کو ادارہ کی طرف سے ٹیپ مہیا کیا جانا ممکن نہیں۔

بزم مردان کی گذارش بزم مردان نے ٹیپ ریکارڈر خریدنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اگر لاہور یا کہیں اور نیا یا سیکنڈ ہینڈ مناسب قیمت پر فروخت کے لئے کسی بزم کے علم میں ہو تو ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب ترجمان بزم طلوعِ اسلام مردان کو مطلع کیا جائے۔

کنونشن کے سلسلے میں نمائندوں کے سابقہ اجتماع میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ طلوعِ اسلام کنونشن کے لئے اپنے برتن خرید لئے جائیں تاکہ ہر سال اس قدر خرچ کی کفایت ہو جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے مختلف بزموں کی طرف سے امدادی وعدے ہوئے تھے اور طے یہ پایا تھا کہ یہ روپیہ بکیم جنوری تک محترم چوہدری عبدالرحمٰن صاحب، صدر کنونشن کمیٹی کو بھیج دیا جائے۔ چوہدری صاحب نے اطلاع دی ہے کہ اس وقت تک بہت کم وعدے ایفا ہوئے ہیں۔ چونکہ (چینی کے) برتن آرڈر دے کر بنوائے جائیں گے اور اُن کی تیاری میں وقت لگے گا اس لئے ضروری ہے کہ اس مد کی موعودہ رقم جلد از جلد اکٹھی ہو جائے۔ لہٰذا تاکیداً تحریر ہے کہ بزمیں اپنے وعدوں کے مطابق روپیہ چوہدری صاحب موصوف کو بہت جلد بھیج دیں۔

چوہدری صاحب کا پتہ:- "بہترین ہاؤس۔ متصل پاکستان منٹ۔ شالامار ٹاؤن ۔ لاہور" ہے۔

ابلیس و آدم
قیمت ۸/-

جوئے نور
قیمت ۶/-

برق طور
قیمت ۶/-

شعلۂ مستور
قیمت ۶/-

ملنے کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی۔ گل برگ۔ لاہور

اب قیمتیں گر رہی ہیں

لہٰذا اور زیادہ بچت کیجئے

ہماری نئی حکومت کی کوششوں سے
چیزوں کے دام رفتہ رفتہ کم
ہو رہے ہیں۔ اس خوشگوار تبدیلی
سے روپے کی قوتِ خرید بڑھتی جا رہی
ہے۔ لہٰذا اب بچت کی ضرورت اور بڑھ
گئی ہے۔ آپ بھی زیادہ
بچت کیجئے۔

آج کی بچت کل آپکے کام آئے گی

اپنی بچت کا روپیہ

قومی ترقی کے
سیونگز سرٹیفکیٹ

میں لگایئے

سرٹیفکیٹ پانچ روپے سے پانچ ہزار روپے
کی مالیت کے ہوتے ہیں اور ایک شخص تنہا
تیس ہزار روپے تک لگا سکتا ہے۔
پانچ فیصد منافع۔ دس روپے کا سرٹیفکیٹ
دس سال بعد پندرہ روپے کا ہو جاتا ہے۔
اس روپیہ پر انکم ٹیکس کی رعایت ہے۔ خریدے
جانے کے ایک سال بعد کسی بھی وقت
سرٹیفکیٹ بھنائے جا سکتے ہیں۔

تفصیلات تمام ڈاکخانوں سے حاصل کی جا سکتی ہیں